ابوالفتح فتح علی سلطان ٹیپو کی

تصویر کا دوسرا رخ

[illegible]

فہرست مضامین

دیباچہ

• زمانہ طالب علمی ہی سے تاریخ کی درسی کتابوں کی روایات پر مجھے بہت کم اعتبار تھا۔ پھر جب اسکول کی چھٹیوں کے ساتھ مجھے ممالک متحدہ اور اس کے آس پاس کے صوبوں کے چھوٹے بڑے شہروں میں جانے کا تقریباً تیس سال تک اتفاق ہوا تو ہندو اور مسلمانوں کے بے شمار پاک اور مقدس مقامات کے دیکھنے اور ان کے متولیان اور پجاریوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملا تو رہے سہے اعتبار کی بنیاد بھی کھوکھلی ہو گئی۔ دوران ملازمت میں جو سررشتہ تعلیم سے متعلق تھی اور کتابیں پڑھنے کو ملیں تو اس بقیہ اعتبار کی پونجی بھی ختم ہو گئی۔

جی چاہتا تھا کہ ہندوستان اور اس کے والیان کی کچھ تاریخیں پڑھنے کے لیے ملیں اور جب اسکول کے بچوں کے ذہنی انقلاب کو دیکھتا تھا تو یہ خواہش اور بھی تیز ہو جاتی تھی کہ مجھے کچھ نہ کچھ ایسا لکھنا چاہیے جو ان بچوں کے خیالات کو صحیح راستہ پر ڈال سکے پھر یہ خیال [illegible]

ملک میں اب بھی ہے حالانکہ ضرورت اسی کی زیادہ ہے کہ بچوں کی اس ذہنی خرابی کو روکا اور درست کیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ ملک کی فضا کی خرابی کی ایک بڑی وجہ ہمارے اسکولوں میں غلط قسم کی کتابوں کا رواج ہے اور اسی نے ہمارے ملک کے بچے اور بچیوں کے خیالات کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ اب اُن میں رواداری کا نام تک باقی نہیں رہا پھر ملک بھر میں سیاسی تحریکوں نے نفرت کی اس دبی ہوئی آگ کو تیل اور ہوا کا کام دے کر بھڑکا دیا اور اب اُسی کے بے پناہ شعلوں میں تمام ملک بُری طرح سے گھر گیا ہے۔

میرے جذبات کا قدرے اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عرصہ ہوا کہ میرے ایک افسر اعلیٰ نے اپنی ایک پرائیویٹ نشست میں مجھ سے دریافت کیا کہ اگر میں صاحب اختیار ہو جاؤں تو کیا کروں میں نے عرض کیا کہ صاحب اختیار ہو کر میں سب سے پہلے یہ کروں کہ ملک بھر میں سے درسی تاریخی کتابوں کو جمع کر دوں اور آنکھیں بند کر کے اُن کو خلیج بنگالہ میں ڈبوا دوں تاکہ بچے اس کے زہریلے اثرات سے بچ جائیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا لیکن میں اس کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے وطن اور ملک کی جو کچھ خدمت کر سکتا ہوں کر دوں خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے اب کہ مکروہات زمانہ سے

قدرے فراغت ملی تو میں نے اپنی پہلی فرصت میں اپنے خیالات کو علمی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

مجھے اپنی کوشش کی خامیوں کا پورا پورا احساس ہے لیکن اگر بفضلِ خدا اس کتاب نے تھوڑی سی حد تک بھی میرا مقصدِ دلی پورا کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

اس کتاب میں زیادہ تر عیسائی مورخین کی کتابوں سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ اُن کی تلاش و جستجو مجھ جیسے بے بضاعت انسان کے لیے قریب قریب ناممکن سی تھی لیکن خدا بھلا کرے محمود صاحب بنگلوری کا کہ اُن کی ضخیم تاریخ میں سب مواد یک جا مل گیا اور اس کتاب کی فوری ترتیب پر ایک دوسری کتاب 'ٹیپو سلطان' کے مطالعہ نے مجھے ہمت دلائی۔ اور میں نے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا سپردِ قلم کر دیا۔

ناظرین سے بصد ادب التماس ہے کہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ان واقعات کو پیش کرنے والا کون ہے بلکہ اس پر نظر رکھیں کہ واقعات کیا ہیں۔

'جیلانی'

ملک میں اب بھی ہے حالانکہ ضرورت اسی کی زیادہ ہے کہ بچوں کی اس ذہنی خرابی کو روکا اور درست کیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ ملک کی فضا کی خرابی کی ایک بڑی وجہ ہمارے اسکولوں میں غلط قسم کی کتابوں کا رواج ہے اور اسی نے ہمارے ملک کے بچے اور بچیوں کے خیالات کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ اب اُن میں رواداری کا نام تک باقی نہیں رہا پھر ملک بھر میں سیاسی تحریکوں نے نفرت کی اس دبی ہوئی آگ کو تیل اور ہوا کا کام دے کر بھڑکا دیا اور اب اسی کے بے پناہ شعلوں میں تمام ملک بُری طرح سے گھر گیا ہے۔

میرے جذبات کا قدرے اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عرصہ ہوا کہ میرے ایک افسر اعلیٰ نے اپنی ایک پرائیویٹ نشست میں مجھ سے دریافت کیا کہ اگر میں صاحب اختیار ہو جاؤں تو کیا کروں میں نے عرض کیا کہ صاحب اختیار ہو کر میں سب سے پہلے یہ کروں کہ ملک بھر میں سے درسی تاریخی کتابوں کو جمع کر دں اور آنکھیں بند کر کے اُن کو خلیج بنگالہ میں ڈبوا دوں تاکہ بچے اس کے زہریلے اثرات سے بچ جائیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا لیکن میں اس کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے وطن اور ملک کی جو کچھ خدمت کر سکتا ہوں کروں خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے اب کہ مکروہات زمانہ سے

قدرے فراغت ملی تو میں نے اپنی پہلی فرصت میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

مجھے اپنی کوشش کی خامیوں کا پورا پورا احساس ہے لیکن اگر بفضلِ خدا اس کتاب نے تھوڑی سی حد تک بھی میرا مقصدِ دلی پورا کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

اس کتاب میں زیادہ تر عیسائی مورخین کی کتابوں سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ اُن کی تلاش و جستجو مجھ جیسے بے بضاعت انسان کے لیے قریب ناممکن سی تھی لیکن خدا بھلا کرے محمود صاحب بنگلوری کا کہ اُن کی ضخیم تاریخ میں سب مواد یکجا مل گیا اور اس کتاب کی فوری ترتیب پر ایک دوسری کتاب 'ٹیپو سلطان' کے مطالعہ نے مجھے ہمت دلائی۔ اور میں نے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا سپردِ قلم کر دیا۔

ناظرین سے بصد ادب التماس ہے کہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ان واقعات کو پیش کرنے والا کون ہے بلکہ اس پر نظر رکھیں کہ واقعات کیا ہیں۔

'جیلانی'۔

تمہید

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد ہیں۔
آج کل اُن کے تعلقات نہایت خراب ہیں آپس کے لڑائی اور
جھگڑے اس حد تک پہونچ چکے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا خون
بہا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔ جو بچّے اب اسکولوں
میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آنکھوں کے سامنے یہ خونیں ڈراما
کھیلا جا رہا ہے وہ تو یہ سمجھیں گے کہ یہ دونوں قومیں ہمیشہ سے
اسی طرح دست و گریبان چلی آتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کا
گلا کاٹنا ہی ان کا مشغلہ ہے۔ لیکن اگر ہم ان بچّوں کے سامنے
اب سے پچاس سال پہلے کے ہندوستان کی تصویر پیش کریں تو
شاید ہی اُن کو یقین آئے کہ اسی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان
بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے ایک دوسرے کے غمخوار و غمگسار
تھے ایک دوسرے کی شادی خوشی اور رنج و غم میں قریبی عزیزوں
اور رشتہ داروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ سماں دیکھا ہے کہ ہندو مسلمانوں
کے اور مسلمان ہندوؤں کے بزرگوں کو چچا۔ تایا۔ ماموں کہہ کر
مخاطب کرتے تھے اور یہ بزرگ بھی اُن کے ساتھ اپنے بچّوں کی
طرح شفقت اور سلوک کرتے تھے۔ عید۔ بقرعید۔ محرم۔ دیوالی

ہولی وغیرہ تہواروں میں بلا امتیاز مذہب شریک ہوتے تھے۔
اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ تہوار کس کا ہے اور کون دوسرے کی
خوشی کے واسطے شریک ہو رہا ہے۔ دیہات میں تو یہ تعلقات
ابھی بیس پچیس سال سے ہی خراب ہوئے ہیں۔

اس مختصر مدت کے اندر اندر تعلقات اس قدر خراب
ہو جانے کے وجوہات ہم کو ہندوستان کی پچھلی صدی کی صحیح
تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ملیں گے۔ اور ہم کو معلوم ہو جائے گا
کہ انگریزوں کی مسلسل پالیسی اور کوشش یہ ہی رہی ہے کہ
"ہندو اور مسلمان کو لڑاؤ اور حکومت کرو" اور وہ اس
حکمت عملی ہی کی وجہ سے ہندوستان میں کامیاب ہوئے ہیں۔

انگریز ایک عقلمند اور سیاست داں قوم ہے اس نے
شروع ہی سے اس راز کو پا لیا تھا اور اپنی اس پالیسی کو کامیاب
بنانے کے واسطے ہمارے ملک کے بچوں کے دماغوں میں ایک
دوسرے کے خلاف نفرت اور عداوت کا زہر ڈالنا شروع کر دیا
اور یہ اسی زہر کا اثر اور نتیجہ ہے کہ جو اب ہماری آنکھوں کے
سامنے ہے۔

قوموں کو غلام بنانے اور غلام رکھنے کے واسطے اُن کی
مادری زبان کو ختم کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ انگریزوں نے
بھی یہ ہی کیا اور ہندوستانی بچوں کو ایک ناقص اور زہر سے

بھرے ہوئے نظام تعلیم پر ڈال دیا۔ اس نظام کے زیر اثر بچوں میں سے رفتہ رفتہ وہ سب صلاحیتیں مفقود ہونے لگیں جو آزاد قوم کے بچوں میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی زبان ختم ہوئی اُن کی قومی روایات ختم ہوئیں۔ حتیٰ کہ اُن سے آزادی کے سب جذبات ہی ختم ہو گئے۔ اور اُن کے جسموں کے ساتھ ساتھ اُن کے دل و دماغ بھی غلامی کی سخت زنجیروں میں جکڑے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بچوں میں سے آزادی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو گئی اور تعلیم کا مقصد صرف یہی رہ گیا کہ ہندوستانی انگریزوں کو اُن کی منشا اور ضرورت کے مطابق ملازم مہیا کر سکیں۔

بدقسمتی سے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ہندوستان کی جس قدر درسی تاریخیں مرتب ہوئیں وہ سب اسی ایک جذبہ کے ماتحت لکھی گئیں۔ اور اسکولوں کے اندر اور باہر ہمارے بچوں کو تاریخ کا یہی مسخ اور زہر آلودہ لٹریچر پڑھنے کو ملا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ہندوستان میں سب ہی قسم کے بادشاہ ہوئے اچھے بھی اور بُرے بھی۔ اچھوں میں ایسے بھی گزرے ہیں کہ جن کے کارناموں پر ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اور اُن میں بہت سے کارنامے ایسے بھی ہیں کہ دنیا کی تاریخ مشکل سے اُن کی مثال پیش کر سکتی ہے مگر خود غرض اور چالاک انگریزوں نے ان مرقعوں کو

کچھ ایسے بدنما خدوخال کے ساتھ پیش کیا کہ اُن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اسکول کے بچے جب ان حالات کو کتابوں میں پڑھتے ہیں تو اُن کے دلوں میں قوم اور ملک کے سچے جاں نثاروں کی عظمت اور عزت پیدا ہونے کے بجائے اُن کی طرف سے نفرت اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں میں جو سب سے زیادہ قابل عزت تھے اُن ہی کے حالات لکھنے میں انتہائی بے ایمانی اور تعصب سے کام لیا گیا ہے۔

ان حالات کو پیش کرنے میں ایک خاص پہلو بھی مدنظر رکھا گیا کہ ہندو راجاؤں کے متعلق تو یہ ظاہر کیا گیا کہ اُنھوں نے مسلمانوں پر مظالم کیے اور اُن کے مذہب میں مداخلت کی اور مسلمان بادشاہوں کے بارے میں یہ دکھلایا گیا کہ انھوں نے ہندوؤں پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور اُن کو زبردستی مسلمان بنالیا ان ہی حالات کو پڑھ کر ہندو بچے مسلمانوں سے اور مسلمان بچے ہندوؤں نفرت کرنے لگے۔ اور تاریخ کے ان تاریک واقعات اور تفصیلات نے رفتہ رفتہ اس نفرت کو اس درجہ پہونچا دیا کہ اُس کے نتائج آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور ہم اُسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

اگر ہندوستان اور اُس کے سورماؤں کی صحیح صحیح تاریخ ہمارے سامنے پیش کی جاتی تو شیواجی کی ذات مسلمانوں کے لیے بھی ویسی ہی واجب التعظیم ہوتی جیسا کہ ہندوؤں کے لیے ہے اور

اورنگ زیب پہ ہندو بھی اُسی طرح فخر کرتے جس طرح مسلمان فخر کرتے ہیں۔

بدیشی حکومتوں اور طاقتوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت ملک مختلف چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ان آزاد حکومتوں میں ہندو اور مسلمان۔ تمام یک جہتی و محبت اور میل کے ساتھ رہ رہے تھے اور اپنے اپنے حاکم کی وفادار و جاں نثار تھی۔ نوابوں کی ملازمت میں ہندو افسران اور ہندو راجاؤں کے یہاں مسلمان سپہ سالاران داد شجاعت دیتے تھے اور ترقیاں پا کر ملکی اور فوجی اداروں میں بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر پہونچ جاتے تھے اس اعتماد اور یک جہتی کو ختم کرنے کے واسطے بدیشی حکومتوں کے کارپردازان نے پہلے تو ان ریاستوں کو "ہندو مسلم" کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف اکسایا اور پھر اُن کے افسران مال اور فوج کو طرح طرح کے لالچ دے کر غدّاری اور ملک فروشی کے واسطے تیار کیا اور اس حکمت عملی میں کامیاب ہو کر سب کو یکے بعد دیگرے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ پھر اس قبضہ و اقتدار کو برقرار رکھنے کے واسطے آئندہ نسلوں کے دماغ خراب کرنے کی ضرورت کو ان کے تعلیمی نظام پر قبضہ کر کے اور ان فدایانِ قوم اور ملک کے حالات جن پر ملک اور اس کے بچے فخر کر سکتے تھے

مسخ کرکے پیش کرنے سے اچھی طرح پورا کر لیا گیا۔

۱۸۵۷ء کا شہرۂ آفاق غدر ہندو اور مسلمانوں کی یک جہتی اور آزادی کی تڑپ پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس غدر میں حصہ لینے والے بہت سے ہندو اور مسلمان ہیرو ایسے گزرے ہیں کہ اگر اُن کے صحیح صحیح حالات قوم کے بچّوں کو پڑھائے جائیں تو وہ اُن کی بہادری اور ملک پر جاں نثاری کے گیت گائیں۔ ان حالات کی تفصیل میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملے گا کہ جس سے ہندو مسلم عداوت یا غیر رواداری ظاہر ہوتی ہو۔ مگر ہمارے بچّوں کو تاریخ ملکی جن کتابوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ اس غدر کو دوسری ہی صورت میں پیش کرتی ہیں۔

غدر سے پہلے جن فرماں رواؤں نے اپنی نگاہ دوربین اور عاقبت اندیشی سے بدیشی حکومتوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کو تاڑ لیا تھا اُن ہی میں ہمارے اس مضمون کا ہیرو "سلطان ٹیپو" والی میسور بھی ہے مگر ہندوستان کے اس مایۂ ناز فرزند اور اُس کے عالی وقار باپ حیدر علی کے خلاف ایسے ایسے بے سر و پا الزامات اور اتہامات تراشے اور مشتہر کیے گئے کہ صداقت پسند حضرات ان کو سُن کر حیرت کرتے ہیں۔

اس مختصر مضمون میں سلطان حیدر علی یا سلطان ٹیپو کی سلطنت کی مکمل اور مفصل تاریخ پیش کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے یہ کام تو

اُن مورخین کا ہے جو اُن کے صحیح حالات کے بارے میں تحقیق و تفتیش کر رہے ہیں اور جن کی کوشش کا نتیجہ جلد یا بدیر ہمارے بچوں کے سامنے آئے گا مگر اس قسم کی جو کتابیں اب تک چھپی اور شائع ہوئی ہیں وہ تعداد میں بہت کم ہیں اور بچوں کے معیار سے بلند بھی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ بچوں کو ہندوستان کے نیک فرماں رواؤں کے صحیح صحیح حالات جلد از جلد پڑھنے کے واسطے دیے جائیں تاکہ آپ کے خیالات کی کچھ اصلاح ہو سکے۔

اس لیے اس مختصر رسالہ میں ہم کوشش کریں گے کہ سلطان ٹیپو کے ایسے واقعات اور حالات بچوں کے سامنے پیش کریں جن کی بنا پر وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کا ایک بہترین فرماں روا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جو اب تک اُن کی نظروں سے قصداً پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔

سلطان ٹیپو کے حالات شروع کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے والد بزرگوار سلطان حیدر علی سے ناظرین کا سرسری تعارف کرا دیا جائے تاکہ اُن کو حالات کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ صحیح تعلیم و تربیت سے ہندوستان کیسے کیسے بہادر اور جاں نثار پیدا کر سکتا ہے اور نیز یہ کہ ان گزر جانے والوں نے ہندوستان کی فلاح اور بہبود کے واسطے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

نواب حیدر علی

حیدر علی سنہ ۱۷۲۲ء میں ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کا بچپن تو نہایت آرام اور راحت سے گزرا مگر ابھی پانچ چھ ہی سال کا ہوا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور چچا زاد بھائی جو سرکار میسور کے یہاں ایک معزز عہدہ پر ملازم تھا اس کا کفیل ہوا۔ بھائی نے اُس زمانہ کی معاشرت کے مطابق حیدر علی کو فنونِ سپہ گری کی تعلیم دلائی۔

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کی نگاہیں اُس پر پڑنے لگیں بچپن کے تیور بتا رہے تھے کہ آگے چل کر نام پیدا کرے گا۔ ابتدائی ملازمت میسور کے راجہ کے یہاں کی اور ایسی عمدگی اور خوش سلیقگی سے اپنے فرائض انجام دیے کہ چھوٹے بڑے سب ہی اس کے گرویدہ ہو گئے۔ راجہ بھی اس کی کارکردگی اور بہادری سے ایسا خوش ہوا کہ سنہ ۱۷۵۳ء میں اس کو ایک علاقہ کا گورنر بنا دیا گورنری کے زمانہ میں اُس کو اپنی طبعی جوہر دکھانے کا موقع ملا۔

اس وقت میسور کے علاقہ اور راج میں صرف سرنگا پٹم اور آس پاس کے تھوڑے سے مواضعات شامل تھے۔ مگر جس قدر یہ علاقہ چھوٹا تھا اُسی قدر جلد حیدر علی کو چمکنے اور اپنی قابلیت کے



نواب حیدر علی

جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ راجہ میسور نکمے اور غدار وزیروں کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا اور راجہ کا محل سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ملک دشمنوں کی تاخت و تاراج سے تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ حیدر علی کی دیانت داری اور وفاداری سے وزیر بھی خوش تھے اور راجہ بھی راضی تھا۔ چنانچہ وہ ۱۷۵۵ء میں راجہ کی افواج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ حیدر علی نے پہلے تو اپنی حکمت عملی سے راجہ اور وزیر کے درمیان پڑ کر اُن میں صفائی کرائی اور راجہ کو وہ اختیارات دلائے جو وزیر چھینے بیٹھا تھا۔ اور پھر ملک کے انتظام اور دشمنوں اور باغیوں کی سرکوبی میں مشغول ہو گیا۔ اور بہت جلد ریاست کا انتظام بحال کر کے اُس کو دشمنوں سے پاک و صاف کر دیا۔

اس وقت ہندوستان کے دیسی راجگان اور نوابوں میں ابتری پھیلی ہوئی تھی شہنشاہ دہلی کا اقتدار رفتہ رفتہ زائل ہو رہا تھا اور دکن کی یہ نیم خود مختار ریاستیں آپس کی رقابت کا شکار ہو کر ایک دوسرے کو تباہ اور برباد کرنا چاہتی تھیں۔ یورپ والے بھی ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے تھے۔ اور انگریز۔ فرانسیسی اور پرتگیز تجارت کے بہانے ہندوستان میں اپنی اپنی کوٹھیاں قائم کر چکے تھے۔

ان بدیشی اقوام کے نمائندوں نے ہندوستان کی ابتر حالت سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی مگر ان میں بھی آپس میں

رقابت تھی۔ اور اس وجہ سے وہ کبھی ایک ریاست سے مل جاتے تھے اور کبھی دوسری سے سازباز کر لیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدیشی قوت اور اقتدار تو بڑھنے لگا اور دیسی ریاستیں کمزور ہونے لگیں چنانچہ دکن میں انگریزوں نے نواب کرناٹک سے مل کر فرانسیسیوں کو سخت کمزور کر دیا۔ اسی زمانہ میں جب شمالی ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پاش پاش کر دیا تو مرہٹوں نے دکن میں اپنی قوت کو جمع کرنا اور بڑھانا شروع کیا تھا۔ حیدرآباد اپنی خانہ جنگیوں میں مصروف تھا اور حیدرآبادی شہزادے تخت و ریاست حاصل کرنے کے واسطے رشوتیں دے دے کر باہری قوتوں کی مدد حاصل کر رہے تھے۔ اس جدوجہد میں میر نظام علی خاں کامیاب ہو کر ریاست کا حکمراں ہو گیا تھا۔ اور اُس کو شہنشاہ ہند کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی اُس نے اُن خدمات اور امداد کے صلہ میں جو اس کو ریاست حاصل کرنے میں حیدر علی سے ملی تھی اُس کی سفارش دربار دہلی میں کی جہاں سے سرا کی صوبیداری مع خطاب نوابی حیدر علی کو عطا ہو گیا۔ خطاب کے ساتھ ساتھ نقارہ اور نشان اور دیگر ماہی مراتب بھی مرحمت ہوئے۔

اس اعزاز نے جو اُس کو شہنشاہ دہلی کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا حیدر علی کو میسور کے راجہ کی اطاعت گزاری سے بے نیاز کر دیا۔ مگر اور ریاستیں اس سے جلنے لگیں۔ میسور کا علاقہ سرا کی صوبیداری سے

تحت میں تھا اور اس کی صوبیداری پر تعینات ہو جانے کے بعد
حیدر علی میسور کی ماتحتی سے نکل گیا۔ بلکہ اُلٹا اُس کا نگران ہو گیا۔
میسور کے محل میں اس وقت جو سازشیں ہو رہی تھیں اُن میں
وزیر اور رانیاں خوب دل کھول کر حصّہ لے رہی تھیں۔ حیدر علی
کی بڑھتی ہوئی طاقت اور وقار اُن کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اور
انھوں نے خفیہ طور سے مرہٹوں سے ساز باز کرکے حیدر علی کو
نیچا دکھانا چاہا اور مرہٹوں کی فوجیں نہایت خاموشی سے حیدر علی
کو گرفتار کرنے کے واسطے اُس کے صدر مقام پر پہونچ گئیں مگر
"جس کو خدا رکھے اُس کو کون چکھے" عین وقت پر حیدر علی کو بھی
خبر ہو گئی۔ اور وہ جان پر کھیل کر موسلا دھار بارش میں اپنے قلعہ سے
تن تنہا نکل بھاگا۔ کاویری پر پہونچا تو دیکھا کہ دریا نہایت زور وں
سے سیلاب پر ہے اب "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" موت
حیدر علی کے آگے بھی تھی اور پیچھے بھی مگر ان میں سے ایک تھی
باعزّت اور دوسری تھی باذلّت چنانچہ اُس نے بہادروں کی طرح
دریائے کاویری میں کود کر موت کا مقابلہ کرنا پسند کیا۔ خدا اُن کی
ہی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں چنانچہ حیدر علی کی خدا نے
مدد کی اور وہ صحیح وسالم دریا پار کرکے راتوں رات پیادہ پا سفر کرتا
ہوا اپنے دشمنوں سے کوسوں دُور نکل گیا۔ اور مرہٹوں کے جو فوجی
دستے اس کے تعاقب میں گئے تھے ناکام واپس ہوئے۔ اس

ناکامیابی کے بعد مرہٹوں کی پوری فوج جس میں میسور کے غدار بھی شامل تھے اس ارادے سے چلے کہ حیدر علی کو دم لینے کی فرصت نہ دیں مگر حیدر علی اب ایسے علاقہ میں پہونچ چکا تھا کہ جہاں اُس کے تھوڑے بہت جاں نثار موجود تھے وہ دم کے دم میں اپنے آقا کے گرد جمع ہو گئے۔ تعاقب کرنے والی فوج بھی پہونچ گئی، اور معرکہ کا رن پڑا۔ اس لڑائی کا فیصلہ حیدر علی کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ تخت یا تختہ قسمت میں تخت تھا اُس کو دنیا کی طاقتیں کہاں بدل سکتی تھیں چنانچہ متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ حیدر علی سے صلح کرنے پر مجبور ہوئیں۔ راجہ میسور کے محل میں اس غیر متوقع نتیجہ پر آپس میں بگاڑ ہو گیا اور ایک فریق نے جو حیدر علی کا طرفدار تھا ملک کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے واسطے اُس کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت دی۔ حیدر علی نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور سرنگا پٹم جا پہونچا۔ پھر تو قلعہ اور قلعہ والے چشم زدن میں اس کے قدموں پر تھے۔ اُس نے راجہ اور رانیوں کے اقتدار کو بحال رکھتے ہوئے غدار وزیر کو قید کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ تاکہ راجہ اس کی عیاریوں اور شرارتوں سے محفوظ ہو جائے۔ یہ غدار وزیر مرتے دم تک اُس ہی کی قید میں رہا اور بالآخر موت نے اُس کو اس قید سے رہائی دلائی۔ راجہ متواتر اپنی نا اہلیت کا ثبوت دے چکا تھا اس وجہ سے ریاست کا مکمل انتظام حیدر علی کے سپرد کر دیا گیا۔

اور راجہ کے مصارف کے واسطے اُس کے اعزاز اور مرتبہ کا خیال رکھتے ہوئے ایک کثیر رقم مقرر کر دی گئی۔ اسی واقعہ کے متعلق بعض کوتاہ اندیش لوگ حیدر علی پر الزام لگاتے ہیں کہ اُس نے ایک ہندو راجہ کی سلطنت غصب کر لی اُن کی تسکین کے واسطے ہم شری متی سیتا دیوی کے ایک تاریخی مضمون سے ذیل کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ محترمہ موصوفہ تحریر فرماتی ہیں کہ :-

"حیدر علی پر سب سے پہلا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے ہندو راجہ سے غداری کر کے اُس کا ملک چھین لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ الزام بالکل غلط نظر آئے گا۔ حیدر علی کے عروج سے پہلے میسور ایک بہت ہی معمولی سی ریاست تھی جس میں صرف ۳۳ گاؤں شامل تھے یہاں کے راجہ پہلے بیجاپور کے مسلمان بادشاہوں کے باجگزار تھے۔ اس کے بعد ۱۶۸۷ء میں وہ شہنشاہ اورنگ زیب کے باجگزار ہو گئے چند سال کے بعد اورنگ زیب نے میسور کے راجہ چک دیو کو جگدیو کا خطاب دے کر نوبت اور نقارہ رکھنے کی اجازت دے دی۔ میسور کی جاگیر سرا کے مغل گورنر کے ماتحت تھی۔ حیدر علی راجہ میسور کی ملازمت میں سپہ سالاری کے عہدہ تک پہونچا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد مغل شہنشاہ ہند نے حیدر علی کو سرا کا گورنر مقرر کر دیا اور اُسے شاہانہ مراتب اور

نقارہ اور نشان مع خطاب نوابی دربار مغلیہ سے عطا ہوئے۔
اس طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حیدر علی اب راجہ میسور کے
ماتحت نہ رہا تھا بلکہ راجہ میسور اس کے ماتحت تھا۔ لیکن اس کے
باوجود اس نے اپنے راجہ کی ہمیشہ عزت کی باوجودیکہ راجہ میسور
۳۳ گاؤں کا مالک تھا اور حیدر علی کے زیر نگیں اسی ہزار میل
مربع ملک تھا۔ لیکن وہ راجہ میسور کو اپنا آقا سمجھتا تھا۔ اور اس کی
ہر ممکن خدمت کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتا تھا۔ اس نے کئی بار
میسور کو تباہی سے بچایا لیکن جب راجہ کے نمک خوار وزیروں نے
راجہ کو بالکل مفلوج کر دیا اور خود وفادار حیدر علی کے خلاف
سازشیں کرنے لگے تو اس نے مجبور ہو کر جاگیر میسور کی زمام
خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور راجہ کو ایک باجگزار والیِ ریاست
کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں رکھا۔ حیدر علی کے لیے آسان تھا
کہ وہ اسی طرح جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے ارکاٹ۔ اودھ
ناگپور اور ستارہ کے شاہی خاندانوں کو بے نشان کر دیا میسور
کے شاہی خاندان کو جلا وطن کر دیتا۔ لیکن نہیں بدنام حیدر علی
نے راجہ میسور کے اعزاز اور مناصب کو بدستور قائم رکھا۔ دسہرہ
کے موقع پر راجہ کا جلوس نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکلتا تھا
اور اس موقع پر جو دربار ہوتا تھا اس میں حیدر علی اور اس کے
لڑکے ٹیپو سلطان کی جانب سے راجہ کی خدمت میں نذریں پیش کی جاتی

تھیں کیا اس کے بعد بھی حیدر علی کو غدار اور نمک حرام کہا جا سکتا ہے۔"

اس تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد کون صاحب انصاف و عقل حیدر علی پر الزام لگا سکتا ہے۔ اور کون اس کو باور کر سکتا ہے کہ اُس نے میسور کی ریاست کو غصب کر لیا۔ راجہ میسور کے ساتھ اُس نے جو برتاؤ کیا وہ ایک بلند اخلاق۔ بلند ہمت اور اعلیٰ کیرکٹر کو ظاہر کرتا ہے۔ راجہ نے اُس کے ساتھ احسان کیا تھا وہ اُس کو بھولا نہیں بلکہ جوں جوں اُس کی طاقت بڑھی اُس نے راجہ اور اُس کے خاندان اور ریاست سب کی حفاظت کی اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں کیا کہ راجہ کے تخت پر قبضہ کرے۔ ان حالات میں اگر حیدر علی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو وہ راجہ کے خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیتا جیسا کہ اُس زمانہ میں عام طور پر ہو رہا تھا لیکن اگر اس زمانہ کے رئیسوں کی ناعاقبت اندیشی ہندوستان کی بدقسمتی تھی۔ اور حیدر علی کے متعلق غلط واقعات کی ترویج اور شہرت ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک کے بچوّں نے اس فخر ملک کو اب تک نہیں پہچانا۔

۱۷۶۶ء میں میسور کے راجہ کا انتقال ہو گیا راجہ لاولد مرا۔ حیدر علی نے اب بھی ریاست پر قبضہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ راجہ کے خاندان کے ایک بچہ کو جس سے راجہ کو دلچسپی تھی اور جو ہونہار معلوم ہوتا تھا راجہ بنا کر راج گدی پر بٹھا دیا جس قدر

حیدر علی کی طاقت اثر اور اقتدار بڑھ رہے تھے اُسی قدر اُس کے خلاف حاسدوں کے جوش میں بھی ترقی ہو رہی تھی۔ اور اس جوش کو بھڑکانے والی بدیشی حکومتیں تھیں جن کی کامیابی کا راز اسی اس میں تھا کہ دیسی ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف لڑتی رہیں اور آپس میں ملنے نہ پائیں۔ انگریز اور نظام الملک اس سازش میں پیش پیش تھے اور ان کو حیدری فتوحات خار کی طرح کھٹکتی تھیں اُنھوں نے مرہٹوں سے بھی ساز باز کر کے اُن کو اپنی طرف ملا لیا۔ نواب کرناٹک پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھ بک چکا تھا اور ۱۷۶۷ء میں ان سب ریاستوں اور طاقتوں کی متحدہ افواج نے حیدر علی پر فوج کشی کی۔

اس فوج کشی کے متعلق ہمارے اسکول کی درسی کتابوں میں جو وجوہات درج ہیں وہ اصلیت سے بہت دور ہیں ہم ذیل میں چند یورپین مورخین کی تاریخوں سے جستہ جستہ اقتباسات دیتے ہیں اُن کو پڑھنے سے اصل وجوہات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

"ڈیلا فوس" جو صوبہ متحدہ میں بہت دنوں تک ڈائرکٹر تعلیمات رہا ہے لکھتا ہے کہ :- "فتوحات حیدر علی سے خوف زدہ ہو کر نظام الملک۔ مرہٹوں اور انگریزوں نے اتحاد کیا متحدہ فوجیں بغیر کسی وجہ بڑھیں"

ایک دوسرے مورخ سنکلیر کا قول ہے کہ "انگریزوں کو معلوم

ہوا کہ حیدر علی اُن کو ہندوستان سے نکالنا چاہتا ہے تو اُنھوں نے نظام اور مرہٹوں سے مدد مانگی اور تینوں فوجیں میسور پر حملہ آور ہوئیں۔"

تیسرا مورخ تھامپسن کہتا ہے کہ "نظام الملک حیدر علی سے حسد کرتا تھا اور اُس سے نفرت کرتا تھا اس وجہ سے نظام الملک اور انگریزا ور مرہٹوں نے متحد ہو کر میسور پر فوج کشی کی۔"

ان بیانات کو پڑھیے۔ غور کیجیے۔ اور دیکھیے کہ فوج کشی کی وجوہات کس قدر نامعقول ہیں۔ اور پھر ان کو ہمارے بچوں کے سامنے اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ سارا الزام حیدر علی کے سر تھوپ دیا۔ ان بیانات سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ حیدر علی کا اصلی مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا۔ ہمارے اس قول کی تائید اور تصدیق دیگر واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دیسی مورخ نے تاریخ حیدر آبادی میں اس فوج کشی کے جو وجوہات لکھے ہیں وہ ناظرین کے ملاحظہ کے واسطے درج کیے جاتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ "چونکہ اس زمانہ میں کمپنی کو حیدر علی کی روز افزوں ترقی سے اندیشہ تھا اور کمپنی کو لازم تھا کہ اس کا کوئی معقول انتظام اور بندوبست کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خیال رکھے کہ دکن کے اُن رئیسوں کو اپنی طرف ملائے رکھے جن کے ساتھ مل کر حیدر علی اپنی قوت میں اضافہ نہ کر سکے۔ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزوں نے نظام الملک کو ہمیشہ حیدر علی کے

خلاف ہی بھڑکا یا۔

ان لڑائیوں میں بہت سے اُتار چڑھاؤ کے بعد حیدر علی کو فتح اور متحدہ افواج کو شکست فاش ہوئی اور حیدر علی نے جو شرائط پیش کیں اُن کو انگریزوں نے مجبوراً قبول کیا۔

شرائط کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

"آئندہ کمپنی اور حیدر علی ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے اور ان لڑائیوں میں جو علاقے ایک فریق نے دوسرے فریق کے جیت لیے ہیں وہ واپس کر دیے جائیں گے اور جنگی قیدی بھی واپس کر دیے جائیں گے۔ حیدر علی کو تاوان جنگ کے طور پر کچھ علاقہ دیا جائے گا اس صلح نامہ کے شرائط کے مطابق جو علاقہ حیدر علی کو ملا وہ والیِ کرناٹک کی ریاست کا ایک حصہ تھا۔ جس کی وجہ سے وہ رئیس اور بھی حیدر علی سے جلنے لگا اور اس کا دشمن ہو گیا۔

متحدہ افواج کی یہ شکست انگریزوں اور اُن کے حلیفوں کے واسطے نہایت ہی شرمناک تھی اور اس فتح نے حیدر علی اور اس کے لائق فرزند ٹیپو سلطان کی شہرت اور عظمت میں چار چاند لگا دیے۔

سر انوڈ لائل اس صلح نامہ کے متعلق لکھتا ہے :-

"حیدر علی نے اپنی فتح کی یادگار مدراس میں اس طرح چھوڑی کہ اس کے حکم سے انگریزوں نے ایک کتبہ سینٹ جارج کے دروازے پر لگایا جس میں بتایا گیا کہ گورنر مدراس اور ممبران کونسل حیدر علی کے

آگے اپنے زانوؤں پر بیٹھے ہیں اور حیدر علی ایک ممبر کی ناک جو ہاتھی کی سونڈ کے مانند بنائی گئی ہے پکڑ کر کھینچ رہے ہیں جس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں۔ کرنل اسمتھ ایک طرف ہاتھ میں صلح نامہ لیے ہوئے اپنی تلوار توڑ کر رکھ رہا ہے۔"

ان لڑائیوں میں حیدر علی کا بیٹا سلطان ٹیپو بھی شریک تھا اس کی فوجی تربیت اور تجربے اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اور سچ پوچھو تو ٹیپو کی قابلیت اور سرفروشی ہی کی وجہ سے حیدری افواج کو ایسی شاندار فتح حاصل ہوئی تھی۔

آپ نے اس لڑائی کے وجوہات عیسائی مورخین کی زبان سے سن لیے اب اس کے نتائج اور سیاسی اثرات بھی عیسائی مورخین ہی کی زبان سے سنیے اور نتیجہ خود نکال لیجیے۔

بورنگ لکھتا ہے کہ :۔ "کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اپنی نقل و حرکت سے جو اس صلح سے قبل عمل میں آئی میسور کے سردار حیدر علی نے اپنی سلیقہ شعاری اور مادرزاد تدبر و ذکاوت کے اعلیٰ صفات کا اظہار کیا۔ برخلاف اس کے انگریزوں نے کم فہمی اور بودے پن کا ثبوت دیا۔ انھوں نے دوستوں کے انتخاب میں بھی غلطی کی۔"

لائل کہتے ہیں کہ :۔ "اگر جنگ کی ابتدا سیاسی غلطی تھی تو خاتمہ اس سے بھی برا نکلا۔"

ڈیلا فوس کا خیال ہے کہ :۔ "جنگ کا خاتمہ شکست اور بے شرمی پر ہوا"

تھامپسن لکھتا ہے کہ :۔ "حیدر علی طوفان باد کی طرح مدراس کے دروازوں پر نمودار ہوا گورنر اور ممبران کونسل پر اتنا ہراس چھا گیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں اور باغوں میں چھپ گئے اور حیدر علی کے پیش کردہ شرائط پر ۱۷۶۹ء میں صلح ہو گئی"

ایک اور انگریز مؤرخ یوں لکھتا ہے کہ :۔ "اس وقت حیدر علی سیاہ و سفید کا مالک تھا مدراس شہر کی قسمت اُس کے ہاتھ میں تھی اُس کی آمد کا رعب اس قدر غالب ہوا تھا کہ مدراس کا قلعہ اُس کے ہاتھ آجاتا۔ ایسی حالت میں انگریزوں کو اس کی شرائط صلح پر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا"

مگر حیدر علی نے اب بھی اُس رواداری سے کام لیا جو بہادروں۔ جانبازوں اور شریف انسانوں کا شیوہ ہوتا ہے اُس نے "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے یہ صلح کی تھی۔ اور اس صلح نامہ کے ذریعہ انگریزوں کو اپنا دوست بنانا چاہا تھا۔ لیکن حریص۔ لالچی اور خود غرض لوگوں کے وعدے پورا کرنے کیواسطے نہیں کیے جاتے ہیں اور اُن کے نزدیک عہد ناموں کا پابند ہونا بے معنی سی بات تھی۔

اب ایک طرف تو مرہٹے اس کے دشمن تھے ہی دوسری طرف

نظام الملک بھی اس سے ڈرتا تھا اور اسی باعث اس کے خون کا پیاسا تھا۔ نواب کرناٹک پہلے ہی سے اپنی بقا حیدر علی کو فنا کر دینے میں دیکھتا تھا۔ انگریز بھی ہندوستان میں صرف حیدر علی ہی سے خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے حیدر علی کے دشمنوں سے خفیہ سازشیں جاری رکھیں اور جب حیدر علی کو اُن کی مدد کی ضرورت ہوئی اور اُس نے پچھلے عہدنامہ کی رو سے مدد مانگی تو وہ پہلوتہی کر گئے اور جو عہد اُنھوں نے حیدر علی سے کیا تھا اُس کو نہ نبھایا۔

اس عہدشکنی کی داستان تو بہت لمبی چوڑی ہے مگر ہم انگریز مورخین ہی کی تاریخوں سے صرف کچھ اقتباسات دیتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے اپنے عہدنامہ کو کس طرح پورا کیا۔

ڈیلا فوس لکھتا ہے کہ :۔ "جب آزمائش کا وقت آیا تو انگریز اپنے عہد پر پورے نہ اُترے"

رولرس آف انڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔ "عہدنامہ کے الفاظ مختلف المعنی تھے انگریزوں نے اُن سے فائدہ اُٹھا کر حیدر علی کو اس وقت مدد نہیں دی کہ جس وقت اُس کو ضرورت تھی اور اس طرح ایک عمدہ دوست کو دشمن بنا لیا"

۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۲ء تک مرہٹے حیدر علی کے خلاف لڑتے رہے اُن کی یہ خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حیدر علی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے مگر قسمت حیدر علی کے ساتھ تھی اور مرہٹے ان

لڑائیوں میں اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

اب انگریزوں نے لڑائیوں میں بیش از بیش تن دہی دکھلانے کی ٹھان لی اور ۱۷۶۷ء سے ۱۷۸۲ء تک انھوں نے مرہٹوں اور نظام الملک سے مل کر جان توڑ کوششیں کیں کہ کسی نہ کسی طرح حیدر علی کو کچل ڈالیں مگر اُن کو بھی مُنہ کی کھانا پڑی اور کئی مرتبہ حیدر علی کے ہاتھوں شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

حیدر علی انگریزوں اور اُن کی سیاست کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اُس کی دلی خواہش تھی کہ سب ہندوستانی ریاستیں مل کر انگریزوں کا مقابلہ کریں اور دم کے دم میں ان کو ہندوستان سے نکال باہر کریں مگر خود غرضی کا بُرا ہو کسی نے اُس کی بات پر کان نہ دھرا اور انگریزوں ہی کے ساتھ لگے رہے۔ حیدر علی نے یہ بھی چاہا کہ اگر یہ ریاستیں اس کے ساتھ تعاون کر کے انگریزوں سے لڑنے میں جھجکتی ہیں تو اس کو اکیلے ہی انگریزوں سے لڑنے اور ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر لینے دیں مگر ہندوستان کی بدقسمتی کہ اس کی ٹھیک دور اندیشی کی بات کو کسی نے نہ مانا۔ اور سب کے سب اس کے خلاف ہی لڑائیوں میں شامل رہے۔

لائل کا خیال ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں پر اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں پڑی تھی ایک طرف بھونسلہ راجہ ناگپور سے گٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف نانا فرنویس بھی



ان کے خلاف [illegible] کامیاب جنگ میں مصروف تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انگریز اب [illegible]ستان میں کوئی دم ہی کے مہمان ہیں لیکن قسمت کو [illegible] منظور تھا اور ہندوستان کے مقدر میں بدیشی حکومت کی غلامی لکھی جا چکی تھی حیدر علی کی ایک پیش نہ گئی اور اسی کوشش میں اُس کو موت کا پیغام آ پہونچا۔

حیدر علی کی بے وقت موت نے بقول ڈبلیو تھرن انگریزوں کو سنبھال لیا اور اس اطلاع کے سنتے ہی نانا فرنویس نے مجبوراً انگریزوں سے صلح کر لی اس طرح قدرت نے انگریزوں کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی جس کے بعد ایک مرتبہ پھر اُن کے اُکھڑتے ہوئے قدم جم گئے۔

حیدر علی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اُس کی زندگی کا مشن بظاہر ناکامیاب رہا اور وہ ہندوستان کو بدیشی طاقت سے آزاد نہ کرا سکا مگر اس سے اُس کی شہرت بلند ہمتی اور وطن پرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اُس کے جنگی کارناموں، ذاتی کیریکٹر، اعلیٰ سمجھ بوجھ، سیاست دانی وغیرہ وغیرہ کے متعلق ہم ایک مشہور معروف ہندو مورخ کے خیالات کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "انگریزوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے ہندوؤں مرہٹوں۔ جاٹوں۔ گورکھے اور سکھوں سے کئی مشہور و معروف اور زبردست لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ مگر ان میں سب سے

زیادہ طاقتور دشمن انھیں ملا تو وہ حیدر علی تھا۔ جس کو انگریز شکست نہ دے سکے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۸۲ء تک اس نے اپنی بہادری کا سکّہ ان کے دل پر بٹھا دیا۔ اس کا مدراس کا مشہور دھاوا ایک ایسا تاریخی اور جنگی کارنامہ ہے کہ مدت العمر یاد رہے گا۔ مگر اُس کے ساتھ ہی اس کے دل میں اس قدر رحم اور وسعت تھی کہ اُس نے مدراس پر قبضہ نہیں کیا جو اُس کے لیے ایک آسان بات تھی۔ اگر اُس وقت مدراس پر حیدر علی کا قبضہ ہو جاتا تو جنوبی ہندوستان میں اُسی وقت انگریزوں کا قصّہ ختم تھا۔ اس کے بعد کی جنگ میں بھی اُس کو اس قسم کے مواقع حاصل ہوئے۔ مگر قسمت ہندوستان کے خلاف تھی۔ حیدر علی کی وفات میسوریوں اور مرہٹوں کے لیے ایک نقصان عظیم کا باعث ہوئی۔ اُس کی وفات کی خبر سُنتے ہی مرہٹوں نے ہتھیار رکھ کر انگریزوں سے بمقام سالبی انگریزی شرائط پر صلح کر لی۔

حیدر علی اگرچہ ایک جاہل مسلمان اور زبردست سپاہی تھا مگر تعصّب مذہبی سے بالکل مبرا تھا وہ ایک مادر زاد سپاہی اور ایک عمدہ شہسوار تھا۔ حیدر علی کی زندگی میں اُس کے مقابل کا کوئی جنرل ہندوستان میں نہیں نکلا بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں بھی اس پایہ کے لوگ بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ حیدر علی ہی صرف وہ ہندوستانی بادشاہ تھا جس نے اپنے ملک کی مدافعت کے لیے

بحری طاقت قائم کی۔"

ایک اور عیسائی مورخ جس کو حیدر علی کے پاس رہ کر میسور کے حالات دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لکھتا ہے کہ :۔

"محل کے دونوں طرف متعلقہ کمروں میں سلطنت کے دفاتر ہیں۔ یہاں شاہانہ سطوت حکومت نہیں کرتی بلکہ باقاعدگی اور سلیقہ شعاری کی حکومت ہے سزا دینے کے واسطے دو ہزار شوسپچی ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور اُن کے ہاتھ سے نہ افسر بچتے ہیں اور نہ شہزادے۔ جب میں حیدر علی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تو اس نے تھوڑے وقت میں ایک ہی دفعہ کئی عرضیاں سُنیں اور جواب لکھوایا۔ اس کو یہ پروا ہی نہ تھی کہ لوگوں کا مذہب کیا ہے اُس نے ہر ایک کو اُس کی خواہش اور عقیدے پر آزاد چھوڑ دیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کام میں منہمک رہتا گویا وقت اور کام کا غلام ہے ہر ایک کام خواہ کتنا ہی چھوٹا ہوتا خود ہی نگرانی کرتا۔ یہاں تک کہ خیموں کے لیے رسیاں ہیں یا نہیں وہ بھی خود دیکھتا۔"

اس اقتباس سے بھی اس کی رواداری اور سلیقہ شعاری کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے صرف اُن مورخین کی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے ہیں جو حیدر علی کے ہم مذہب نہیں تھے تاکہ طرفداری کے ساتھ رائے قائم کرنے کا احتمال نہ رہے۔ ان مورخین میں سے زیادہ تر عیسائی اور غیر ملکی لوگ ہیں۔ یہ اقتباسات ایسے ہیں کہ اگر

ان پر غیر جانبداری سے غور کیا جائے تو ناظرین خود صحیح نتیجہ پر پہونچ کر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ حیدر علی کے متعلق رائے قائم کرنے میں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ حیدر علی نہ تو کسی شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا اور نہ کوئی سلطنت اس کی پشت پناہی پر تھی۔ پانچ چھ سال کی عمر میں یتیم ہوا۔ تعلیم سے بھی بے بہرہ رہا مگر ذہن کا تیز ارادہ کا پکا تھا۔ ذرہ سے آفتاب بن کر چمکا اور اُن کی دوراندیشی اور سیاست دانی کے معیار تک ہندوستان کا کوئی بادشاہ نہیں پہونچ سکا۔ مغرب کے تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کو حیدر علی سے بڑھ کر اور کوئی زبردست حریف نہیں ملا۔ اور تمام بڑے بڑے معرکوں میں اُس نے انگریزوں کو شکست دی وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی ہستی کا قیام اور بقا حیدر علی ہی کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا تھا۔ واقعی اگر حیدر علی کو ایک اور صرف ایک اپنا جیسا ساتھی مل جاتا تو وہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی فتوحات کا ڈنکا بجا دیتا۔ مگر اس کو تو اس کے ہم مذہب مسلمان نوابوں، اس کے اہل وطن ہندو راجاؤں اور بیرونی دشمنوں نے بچپن سے لے کر موت کے وقت تک ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ لیکن باوجود اس کشمکش کے وہ اپنی وفات کے وقت ایک ایسی طاقتور اور زبردست سلطنت

چھوڑ گیا جو آج کل کی بہت سی طاقتور سلطنتوں سے بڑی اور بہتر حالت میں تھی۔ اور یہ اُس کی قابلیت اعلیٰ ہمت اور رواداری کا کُھلا ہوا ثبوت ہے۔

ملکوں کی ترقی اُن کی اقتصادی حالت اور تجارت کے اوپر منحصر ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت تک ہندوستان کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کی نگاہ اس بات پر نہیں پہونچی تھی کہ مغربی ممالک کی ترقی اور مشرقی ممالک کی تنزلی کا راز اُن کی بحری طاقتوں میں پوشیدہ ہے۔ جب سے مغربی ملک والوں نے سمندروں کو کھنگال کر راس امید کے گرد سے جہازرانی کا راستہ معلوم کر لیا تھا تو تجارت جو اب تک صرف بری راستوں کے ذریعہ ہوتی تھی ایشیائیوں کے ہاتھوں سے نکل کر یورپین اقوام کے ہاتھوں میں جارہی تھی۔ اور ہندوستان کا ساحل بحری مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت یوروپین اقوام کا جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ حیدر علی کے زمانہ میں بھی پرتگیز۔ انگریز اور فرانسیسی صرف بحری طاقتوں ہی کی وجہ سے ہندوستان میں اپنا اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے۔ اس وقت ہندوستان کے سب ہی حکمراں اپنی اپنی طاقتوں کو آپس کی لڑائیوں اور رقابتوں میں صرف کر رہے تھے اور یوروپین اقوام کی جدو جہد سے بے خبر تھے۔ مگر حیدر علی کو ایک طرف تو ان ریاستوں کی دست بُرد سے اپنا بچاؤ کرنا تھا اور دوسری طرف

وہ سمجھ چکا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حفاظت کے واسطے بحری طاقت نہ ہوگی اُس وقت تک اس ملک کو مغربی اقوام کی ہوس کے چنگل سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی ریاست میں ایک بحری بیڑے کے قیام کا بھی ڈول ڈالا۔

اگر حیدر علی کی زندگی کے سب کارناموں کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ ذاتی اغراض پورا کرنے کے واسطے کیا تو اُس کا صرف یہی ایک کارنامہ ایسا ہے کہ تاریخ میں اس کا نام سُنہرے حروف سے لکھا جائے۔

قوموں کی ترقیاں عام طور پر صدیوں میں ہوتی ہیں اور ایک فدائے قوم کا ایثار برسوں کے بعد پھلتا پھولتا اور بار آور ہوتا ہے مگر اچھے نتائج کا سہرا خواہ وہ صدیوں بعد ہی رُونما کیوں نہ ہو ہمیشہ اُسی کے سر باندھا جاتا ہے کہ جس نے پہلے پہل اس نتیجہ کے اسباب پیدا کرنے کے واسطے جدوجہد کی ہو۔

حیدر علی کے مختصر حالات ناظرین کے پیش نظر کرنے کے بعد ہم اگلے باب میں اُس کے فرزند اور جانشین **سلطان ٹیپو** کے حالات پیش کرتے ہیں۔





ٹیپو سلطان بحالت جوانی

۳۷
سلطان ٹیپو

رُباعی:- عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

سلطان ٹیپو کی پیدائش عام حالات سے ذرا مختلف ہے۔ اس لیے اس کو یہاں بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیگم حیدر علی کے عرصہ تک کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی بہت علاج معالجہ ہوا مگر اس کی بیماری کے متعلق اطبّا کی یہ رائے ہوئی کہ نہ تو اس کو صحت ہو سکتی ہے اور نہ اس کے اولاد ہی پیدا ہو سکتی ہے بیگم کو یہ معلوم ہو کر نہایت افسوس ہوا کیونکہ حیدر علی کے دل میں قدرتاً اولاد کی خواہش تھی۔ پس اس نے اپنی مجبوری اور بے بسی اپنے شوہر نامدار کی خواہشِ اولاد کا خیال کرتے ہوئے اُس کو مجبور کیا کہ وہ ایک اور شادی کرے تاکہ اُس کے خاندان کا سلسلہ جاری رہے اور اُس کا نام روشن ہو۔ گو حیدر علی یہ نہیں چاہتا تھا مگر بیوی کے بے حد اصرار پر آخر کار وہ بھی دوسری شادی کرنے پر راضی ہو گیا اور اس طرح دوسری شادی ہو گئی۔ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ عرصہ تک دوسری بیوی سے بھی کوئی اولاد پیدا

نہیں ہوئی۔

حیدر علی ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے نیک فقیروں کو بہت مانتا تھا اور ان کی دعاؤں کے اثر کا بھی قائل تھا۔ اس امر کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ اس نے اپنے ذاتی اور ملکی مفاد کے واسطے مذہبی بزرگوں سے دعاؤں کی التجائیں کی ہیں چنانچہ وہ حضرت ٹیپو مستان شاہ سے جو ہندو اور مسلمان دونوں سب کے واجب التعظیم بزرگ تھے دعا کا طالب ہوا۔ حضرت نے دعا فرمائی اور خدا کی قدرت سے اُن کی دعائیں قبول ہوئیں اور حیدر علی کی دوسری بیگم کے بطن سے ۱۷۵۰ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کا نام حضرت مستان شاہ کے نام نامی پر فتح علی ٹیپو رکھا گیا تاکہ شاہ صاحب کے نام کی برکت شامل رہے چنانچہ اس بچے کے اصل نام کو تو لوگ بھول گئے اور وہ صرف ٹیپو ہی کے نام سے مشہور و معروف ہوا اور تاریخوں نے بھی اس کے اسی نام کو دُہرایا ہے۔

اس بچہ کے ذہنی ارتقا پر ماں باپ کے خیالات اور اعمال کا نمایاں اثر پڑا۔ وہ ذہین۔ ہوشیار اور دلیر بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کا رجحان علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف زیادہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن شہزادہ کھیل رہا تھا ایک باکمال درویش کا ادھر سے گزر ہوا۔ اُس نے بچہ کو دیکھا اور فرمایا کہ بڑا ہونہار اور خوش نصیب بچہ ہے بڑا ہوکر اس ملک پر حکومت کرے گا۔ اور

بچہ سے کہا کہ جب تو بادشاہ ہو تو اس جگہ ایک مسجد بنوانا تاکہ تیری یادگار رہے۔ شہزادہ نے بھی یہ تقریر سنی اور ہنس کر عرض کیا کہ جب بادشاہ ہوں گا تو ضرور مسجد بنواؤں گا۔

فقیر کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور شہزادہ نے بھی اپنا بچپن کا قول پورا کیا چنانچہ اسی جگہ ایک شاندار مسجد موجود ہے جو شہزادہ کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ کرتی ہے۔

شہزادہ کی پیدائش باپ کے واسطے بھی مبارک ثابت ہوئی اور وہ اس مولود مسعود کی پیدائش کے بعد برابر ترقی کے زینوں پر چڑھتا رہا یہاں تک کہ سپاہی کے درجہ سے بڑھ کر صاحب اختیار رئیس ہوا اور اس کی شہرت۔ بہادری اور سیاست دانی کا شہرہ ہندوستان سے نکل کر ایشیا اور یورپ کے دیگر ملکوں تک پہونچا۔ ہندوستان میں تو اس کی دھاک ایسی بیٹھی کہ ہم عصر ریاستیں اس کی امداد اور دوستی کی متمنی تھیں اور اس کے دشمن اس کے نام سے کانپتے اور تھرّاتے تھے۔

حیدر علی نے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے واسطے اچھے سے اچھے استادوں کا انتخاب کیا۔ علوم و فنون اور امور سلطنت کی تعلیم کے واسطے علیحدہ استاد مقرر کیے اور فنون سپہ گری کے واسطے علیحدہ۔

ان استادوں کی محنت اور توجہ اور شہزادہ کی ذہانت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ جوان ہوتے ہوتے رسمی اور رائج الوقت علوم و

فنون میں ماہر ہوگیا۔ باپ کا خیال تھا کہ شہزادوں کو اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ اہل سیف بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ استادوں کی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اُس نے شہزادہ کو فنون جنگ کی عملی تعلیم دینے کے واسطے اپنی نگرانی میں لیا اور اس کو اپنے ساتھ لڑائیوں میں شریک کرنے لگا۔ ان معرکوں میں شہزادہ نے بہت جلد اپنی قابلیت کے جوہر دکھلائے اور ایسی ہمت اور دلیری سے کام لیا کہ باپ کو اطمینان ہوگیا اور وہ شہزادہ کو آزادانہ فوج کی کمان دینے لگا۔ میسور کی پہلی لڑائی میں ٹیپو نے کئی مورچوں پر انگریزوں کی فوجوں کے دانت کھٹے کر دیے اور ان کو شکست دی مدراس کے قلعہ پر بھی اسی نے دھاوا کر کے انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ حیدر علی کی پیش کی ہوئی شرطوں کو مان کر صلح کرلیں۔ اسی طرح شہزادہ نظام اور مرہٹوں کے خلاف بھی لڑائیوں میں شریک ہو کر داد شجاعت دیتا رہا اور بہت جلد ایک آزمودہ کار جنرل بن گیا جس کا اعتراف اس کے دشمنوں نے بھی کیا ہے۔

جب شہزادہ کی عمر بائیس سال کی ہوئی تو ۱۷۷۴ء میں حیدر علی نے اس کی شادی خانہ آبادی سے بھی فراغت حاصل کرلی۔

شادی سے فرصت پانے کے بعد حیدر علی پھر لڑائیوں میں مصروف ہوگیا لیکن ابھی میسور کی دوسری جنگ ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ شہزادہ ٹیپو اس وقت میدانِ جنگ

بیا تھا۔ باپ کے انتقال کی خبر پاتے ہی سرنگا پٹم واپس آیا اور ۱۷۸۲ء میں جب کہ اس کی عمر صرف تیس سال کی تھی باپ کی گدی پر مسند نشین ہوا۔ اب سلطنت کا پورا پورا بار نوجوان شہزادہ کے کندھوں پر پڑ گیا۔ اس نے تخت نشینی کی رسموں سے فراغت پاتے ہی پھر اُن لڑائیوں کی طرف توجہ دی جو اس کے والد کے زمانہ حیات میں جاری ہوئی تھیں مگر اس کی موت نے ان کو فیصلہ کن حدود تک نہیں پہونچنے دیا تھا۔ ان لڑائیوں میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ جنگ انگریزوں کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس لڑائی میں بہت سے معرکہ پیش آئے اور ان میں اُتار چڑھاؤ کے ساتھ کبھی انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور کبھی سلطانی فوج کو۔ مگر پلّہ ہمیشہ سلطان ہی کا بھاری رہا۔ چنانچہ مجبور ہو کر انگریزوں کو ۱۷۸۴ء میں صلح کی درخواست دینا پڑی جس کو سلطان نے بخوشی منظور کر لیا اور انگریزی افواج اپنے مستقر کو واپس ہو گئیں۔

حیدر علی کی بے وقت موت اور نوجوان سلطان کو انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں پھنسا ہوا دیکھ کر ملک کے اندر بہت سے باغیوں نے سر اُٹھایا مگر سلطان نے لڑائی سے فرصت پاتے ہی اُن کی سرکوبی کی طرف توجہ دی اور سب کو یکے بعد دیگرے زیر کیا اور قرار واقعی سزائیں دیں۔

نظام اور مرہٹوں کو اُمید تھی کہ نوجوان سلطان انگریزوں سے لڑتے اور ملک میں سازشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے سر نہ اُٹھا سکے گا لیکن اس کی کامیابی نے ان دونوں حریفوں کو خوف زدہ کر دیا اور وہ دونوں پھر اس کے خلاف سازش کر کے آپس میں مل گئے اور اس کے ملک پر فوج کشی کی تیاریاں کرنے لگے۔ سلطان کو صلح چاہتا تھا مگر باعزت صلح۔ اس نے کوشش کی کہ ان ریاستوں سے اس کی نہ بگڑے مگر مرہٹوں اور نظام کے دل صاف نہیں تھے اور ان کو خیال تھا کہ اس وقت سلطان کی حالت کمزور ہے اور یہ ہی وقت اس کو زیر کرنے کے واسطے موزوں ترین ہے۔ چنانچہ ان کی متحدہ افواج نے سلطان کے ملک کے اندر گھس کر پیش قدمی کی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ سلطان بھی مجبوراً مقابلے کے واسطے تیار ہو کر نکلا۔ شاہ نور میں فیصلہ کن معرکہ ہوا اور مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج کو شکست فاش ہوئی۔

اس جنگ کے دوران میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ جن سے سلطان کے کیرکٹر اور سیاسی نظریہ پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں کیا سلوک کرتا تھا لہذا ہم ان کو نہایت اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔

قلعہ اوہونی پر مہابت جنگ نے جو نظام کا داماد تھا قبضہ کرلیا جب سلطانی فوجوں نے حیدرآبادی فوجوں کو قلعہ سے مار بھگایا اور قلعہ پر قبضہ کرنے کے واسطے آگے بڑھیں تو سلطان کو معلوم ہوا کہ بزدل مہابت اپنی حرم کو قلعہ ہی میں چھوڑ بھاگا ہے۔ سلطان نے مستورات کی موجودگی کا احترام کرتے ہوئے مزید گولہ باری اور فوج کی پیش قدمی کو رکوا دیا۔ فوجی افسران نے لاکھ سر مارا اور اصرار کیا مگر سلطان نے اُن کی ایک نہ مانی اور اپنے اصول سے نہ ٹلا۔ جب مستورات سے قلعہ خالی ہوگیا اور وہ حفاظت کے ساتھ مہابت جنگ کے نئے کیمپ پر پہونچا دی گئیں تو دوبارہ فوج کشی کرکے قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا اور قبضہ کے بعد قلعہ پر ایک مسلمان قلعہ دار اور ایک ہندو صوبہ دار مقرر کیا۔

مرہٹوں کے خلاف لڑائی میں سلطان کے فوجی سپاہیوں کی بدعنوانی اور لاپروائی کی وجہ سے چند مستورات دریا میں غرق ہوگئیں۔ جب سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے بذات خود اس معاملہ کی جانچ پرتال کی اور اس کے صحیح ثابت ہونے پر سپاہیوں کو اُن کی لاپروائی پر عبرتناک سزائیں دیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صنف نازک کے احترام میں وہ دوران جنگ میں بھی فوجی لوگوں کو سخت سزائیں دینے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

اسی جنگ میں ایک وقت ایسا آیا کہ دریائے تنگ بھدرا بہت
زوروں سے طغیانی پر تھا اور سلطانی فوجیں دریا کو پار کرنے کے
واسطے بیتاب اور بے قرار تھیں جب انتظار زیادہ کرنا پڑا اور
دریا کی طغیانی کسی طرح کم نہ ہوئی تو سلطان کے حکم سے دریا کے
دوسرے پار توپ کے اکیس گولے مارے گئے۔ خدا کی قدرت دیکھیے
کہ گولے پہنچتے ہی دریا کا پانی گھٹنے لگا اور دریا پایاب ہو گیا اور
سلطانی فوج نے اطمینان سے دریا پار کر لیا۔ اس زمانہ میں اس
واقعہ نے لوگوں کے دلوں پر کافی اثر ڈالا۔

پھر سلطان نے دریا پار کرکے اپنی فوجوں کو کچھ ایسی ترتیب سے
بڑھایا کہ سرداران مرہٹہ سراسیمہ ہو گئے اور میدان جنگ چھوڑ بھاگے
اس بھگدڑ میں اُن کے اہل و عیال سلطانی فوج کے ہاتھوں میں پڑ گئے
مگر سلطان نے ان کے ساتھ نہایت محبت اور عزت کا برتاؤ کیا
اور ان کو اپنے آدمیوں کی نگرانی میں مرہٹوں کے کیمپ میں بھجوا دیا۔

ریاست شاہ نور کے حاکم عبدالحکیم نے سلطان کے دشمنوں
سے مل کر ان کو اپنی حدود میں بلا مزاحمت آنے دیا اور اپنا قلعہ
بھی ان کے سپرد کر دیا تاکہ سلطانی افواج کا مقابلہ آسانی سے
کیا جا سکے مگر نتیجہ پھر بھی ان کی امیدوں کے برخلاف نکلا۔ اور
سلطانی فوج نے مرہٹوں اور نظام کی فوجوں کو بُری طرح سے
کاٹ کر بھگا دیا اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئیں۔ اور اب

حیدرآباد اور پونہ کے راستے سلطانی فوجوں کی پیش قدمی کے واسطے صاف اور خالی تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان ریاستوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ راجہ ہولکر نے پھر ایک مرتبہ سلطانی افواج کو روکنے کی ناکامیاب کوشش کی مگر بہت سا سامان جنگ بھی میدان میں چھوڑ کر بھاگنے پر ایسا مجبور ہوا کہ اس کی حرم سرا بھی مال غنیمت کے ساتھ سلطان کے ہاتھ آئی۔ سلطان نے پھر ان کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے فوجی دستہ کی نگرانی میں پونہ بھجوا دیا۔

مرہٹوں کے سرداروں پر ان سب واقعات اور شکستوں کا بہت گہرا اثر ہوا اور وہ سب سلطان سے صلح کرنے کے واسطے تیار ہوگئے۔ اور بات چیت ہونے لگی۔ ہری پنڈت مرہٹوں کا سپہ سالار بہت بہادر اور جاں باز تھا اور سلطان نے اس کی بہادری کے کرشمے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے چنانچہ صلح ہو جانے پر سلطان نے اپنے بہادر مد مقابل ہری پنڈت کو اس کی بہادری کے صلہ میں بہت بڑی جاگیر بطور انعام دی اور ہری کی سفارش پر عبدالحکیم کو بھی اس کی ریاست واپس کردی۔

ان واقعات کو دیکھیے اور سوچیے کہ یہ بہادر جاں باز کس دل و دماغ اور اخلاق کا انسان تھا اور اس نے میدان جنگ میں بھی کیسے بلند اخلاق اور اعلیٰ سیاست دانی کا اظہار کیا ہے مگر تاریخی

کتابیں جو ہمارے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں اُٹھا کر دیکھ لیجیے کسی میں بھی ان واقعات کا ذکر نہیں ملے گا اور وہ سب کی سب سلطان کے عیوب سے بھری ہوئی ملیں گی۔ ان تاریخوں کے مصنّفین نے ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا ہے اور وہ بھی بدنما خدوخال کے ساتھ۔ اور ہمارے تمام قومی اور ملکی جاں باز انگریزوں کی اسی پالیسی کا شکار ہوئے ہیں۔

سلطان نے متذکرہ بالا لڑائیوں سے فارغ ہوکر اپنی سلطنت کے انتظامات پر توجہ دی مگر اب انگریز اُس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر جو سلطان کی دوسری طرف کی مصروفیت سے اُن کو مل گئی تھی پھر اپنی فوجیں جمع کر رہے تھے تاکہ اس سے اپنی پچھلی شکستوں کے بدلے لیں وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ نظام اور مرہٹوں سے ایسی سخت لڑائیاں لڑنے کے بعد ٹیپو خود ہی کمزور اور بے دم ہوکر بیٹھ جائے گا مگر نتیجہ ان کی امیدوں کے بھی خلاف نکلا۔ سلطان پھر فتحیاب ہوا۔ انگریزوں نے پوری تیاریاں کرلی تھیں اور وہ سلطان کو موقع ہی نہیں دینا چاہتے تھے۔

اس زمانہ میں دنیا کے اور حصوں میں انگریزوں پر سخت مصیبت نازل ہورہی تھی۔ امریکہ سے وہ بے دخل ہوچکے تھے ان کو نئے ملک اور سلطنت کی ضرورت تھی پھر ہندوستان سے بہتر جہاں خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا ان کے واسطے اور کون سا ملک

ہو سکتا تھا۔ لہذا انھوں نے اپنی پوری توجہ اسی کی طرف مرکوز کردی۔ اس ملک کو حاصل کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کی وہ جنوبی ہند میں ابتدا بھی کر چکے تھے مگر سلطان ٹیپو اُن کے راستے میں حائل تھا اور وہی دلیری۔ دانائی اور سیاست میں اُن کا مدمقابل تھا اس کے خلاف فوج کشی کرنے کے واسطے ان کو صرف بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت تھی جس کے مل جانے میں اُن کو چنداں دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بہانہ ڈھونڈھ نکالا گیا اور انگریز سلطان کے خلاف فوج کشی پر آمادہ ہو گئے۔

انگریزوں نے جس وقت اپنی فوجیں سلطان کے خلاف بھیجیں تو سلطان نے بہت چاہا کہ آپس میں بگاڑ نہ ہو اور بات چیت کر کے معاملات طے کر لیے جائیں مگر سے

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

سلطان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ بھی اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

انگریزوں کو اب تک جو تجربات ہوئے تھے ان سے ان کو صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں سلطان سے پیش نہیں پا سکتے ہیں پس انھوں نے اپنی فطری چالاکی اور عیاری سے کام لے کر سیاست کا جس میں وہ شہرۂ آفاق ہیں جال بچھایا۔

انھوں نے ایک طرف تو سلطان کے امیروں ۔ وزیروں ۔ اور قلعہ داروں کو روپیہ ۔ ملک اور جائدادوں کے لالچ دے کر اپنی طرف ملایا اور دوسری طرف ملک میں بدامنی اور بے چینی پھیلانے کے واسطے دولت کے دریا بہا دیے ۔ راجہ میسور کے خاندان والوں کو ریاست واپس دینے کی امیدیں دلا کر ان کی ہمدردیاں سلطان کے خلاف کیں ۔ رانیوں سے خفیہ خط و کتابت جاری تھی ہی ۔ سلطان کو ختم کر دینے کے بعد ریاست پھر رانیوں کو واپس کر دینے کے پچھلے وعدوں کی مزید تجدید کی گئی تاکہ ہندو پبلک میں ہیجان پیدا ہو جائے اور وہ بوقت ضرورت سلطان کے خلاف کھڑی ہو جائے ۔

ان پیش بندیوں کے ساتھ دو انگریزی فوجیں دو مختلف محاذوں سے سلطان پر حملہ آور ہوئیں اور لڑائی کا ایسا نقشہ جمایا کہ سلطان اور اس کی افواج ان فوجوں کے درمیان گھر جائے مگر بقول "بورنگ" "ٹیپو جو ایک ماہر فن اور بہترین جنگی جنرل تھا سمجھ گیا کہ وہ دو فوجوں کے نرغہ میں پھنس جانے والا ہے اس لیے اپنی فوج لے کر پیچھے ہٹا اور درہ تبار سے نکل کر ایک طرف سے آنے والی فوج پر حملہ کر دیا ۔ انگریزی فوج نقصان اٹھا کر واپس ہوئی ۔

اس وقت لارڈ کارنوالس گورنر جنرل تھا اس کو جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے سلطان کے ساتھ پچھلے عہدناموں کو

نظر انداز کرتے ہوئے نظام اور مرہٹوں کو بھی اس کے خلاف اپنے
ساتھ ملا لیا اور میسور کی تیسری لڑائی کی طرح ڈالی۔ اس لڑائی
کے اسباب اور وجوہات کے بارہ میں ہم یہاں مورخین کی چند
رائے درج کرتے ہیں۔ ناظرین انگریزوں ہی کی لکھی ہوئی ان
رایوں کو پڑھ کر خود سمجھ سکتے ہیں کہ کمپنی اور اس کے ساتھی سلطان
پر فوج کشی کرنے میں کس حد تک حق بہ جانب تھے۔

سر جان مالکم لکھتا ہے کہ: "کارنوالس نے اس عہد نامہ کو
نظر انداز کر دیا جو ۱۷۸۴ء میں منگلور میں ٹیپو سلطان اور ایسٹ انڈیا
کمپنی میں ہوا تھا۔ اس کے عوض اس نے اس عہد نامہ کو مستند قرار
دیا جو ۱۷۶۸ء میں ہوا تھا اور جس کی رو سے نظام۔ مرہٹے
سرداران و نوابان اودھ وارکاٹ اور راجگان تنجور اور ٹراونکور
ایک دوسرے کے حلیف قرار پائے تھے۔ ٹیپو سلطان کا نام عمداً
نظر انداز کرنے میں کارنوالس حق بجانب نہیں تھا۔ کیونکہ عہد نامہ
منگلور کی رو سے ٹیپو سلطان بھی انگریزوں کا دوست مانا گیا تھا۔"

کرنل ولکس کہتا ہے کہ: "کارنوالس جیسے سیاست دان
اور انصاف پسند شخص سے یہ امید نہ تھی کہ اس طرح بدعہدی کرے گا
کارنوالس نے مدراس گورنمنٹ کو فوجوں کی تیاری کا حکم دیا کہ
ٹیپو کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ مدراس میں اس وقت مسٹر ہالینڈ
گورنر تھا جس نے جواب میں لکھا کہ ٹیپو سلطان کا ہماری حکومت سے

جنگ کرنے یا عہد توڑنے کا کوئی خیال نہیں۔ مسٹر ہالینڈ کو استعفےٰ دینے پر مجبور کیا گیا اور ٹراونکور کا بہانہ جنگ کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔" "ٹیپو سلطان جنگ کے لیے تیار نہ تھا اور اُس نے اس امر کا یقین بھی دلایا کہ اس کا ارادہ ٹراونکور پر حملہ کرنے کا نہیں ہے۔"

اس جنگ کے ابتدا کرنے کے بارہ میں کارنوالس نے جو خط مدراس کے گورنر کو لکھا ہے اُس کے و نیز دیگر اقتباسات کے دیکھنے سے صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ انگریزوں کا منشا اور ارادہ کیا تھا۔ وہ مدراس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ:۔ "اس ملک میں ہماری شہرت اور عظمت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹیپو سلطان سے نبرد آزما ہوں اور نہ صرف نبرد آزما ہوں بلکہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ٹیپو سلطان کی طاقت کو مٹا دینا چاہیے۔ موجودہ وقت سے بڑھ کر اچھا وقت ہمیں نہیں مل سکتا ہے جب کہ ملک کی دوسری طاقتیں ہماری مدد پر آمادہ ہیں۔ اگر ٹیپو سلطان کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور فرانس والے اس قابل ہو جائیں کہ اس کی کمک کر سکیں تو ہمیں ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑے گا۔"

اگر اقتباس بالا میں شہرت و عظمت کے ساتھ ہم لفظ 'قبضہ' اور بڑھا دیں تو انگریزوں کا مطلب صاف صاف ظاہر ہو جائے مگر گورنر جنرل نے مصلحتاً اس لفظ کو لکھنے سے احتراز کیا ہے حالانکہ کل عبارت کا مفہوم یہی ہے۔ انگریزوں کی انصاف پسندی کا منشا جو

واقعی کارنوالس سے بہتر اور کون کرسکتا ہے جو خود بڑی سے بڑی بدعہدی کرتا ہے اور اپنے ماتحتوں کو بھی بدعہدی اور بے ایمانی کرنے پر مجبور کرتا ہے اور جب دوسرا انصاف پسند شخص بدعہدی یا بے ایمانی کا مرتکب نہیں ہوتا ہے تو اس کو اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کاش کوئی انصاف پسند مسٹر ہالینڈ کے نام کے ساتھ ہی لفظ "انصاف پسند" بڑھا دیتا! مگر کیوں؟

ہم نے بارہا انگریزی کا لفظ ٹیکٹ (TACT) سنا اور اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی مگر سوائے اس کے کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اپنا مطلب حاصل کر لینا ہی "ٹیکٹ" ہے۔ اور یہ اقتباس اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ بدقسمتی سے آج کل بہت سے ہندوستانی بھی اپنی مطلب برآری کے واسطے "ٹیکٹ" استعمال کرتے ہیں اور اس کو انسانی کیرکٹر کی ایک خوبی سمجھنے لگے ہیں مگر ٹیپو سلطان کے حالات شروع سے آخر تک پڑھ جائیے پوری داستان میں اس "ٹیکٹ" کی ایک مثال بھی نظر نہیں آتی اور سچ تو یہ ہے کہ یہی بات اس کی ناکامیابی کی اصل وجہ ہے۔

حیدرآباد نے ان سازشوں میں جو حصہ لیا اس کے متعلق ایک دوسرا مورخ بیان کرتا ہے کہ:۔ "۱۷۹۰ء میں جس وقت سلطانی فوج نے تمام پائیں گھاٹ کو مسخر کر لیا اور انگریزی فوج مدراس میں جہاز کی پناہ میں آ گئی تو تمام ملک کرناٹک کو ٹیپو سلطان کے قبضہ میں جاتا

دیکھ کر حیدر آباد کے وزیر اعظم مشیر الملک نے ابو القاسم خاں عرف میر عالم کو کلکتہ بھیجا کہ گورنر جنرل کو سلطان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرے۔"

ہندوستانی ریاستوں میں سے ایک بڑی ریاست تو اس طرح خود ہی ٹیپو سلطان کے خلاف تھی اور خود انگریزوں کو اس کے خلاف جنگ کے واسطے آمادہ کر رہی تھی۔ ادھر گورنر جنرل نے مرہٹوں کو اپنی طرف ملانے کے واسطے اپنے ایک افسر کو لکھا کہ:۔

"اگر مرہٹے اس جنگ میں ہمارے ساتھ شامل ہونا نہیں چاہتے تو کوئی راہ ایسی اختیار کی جائے جس کی بنا پر وہ ہم سے مل جائیں۔"

مسٹر مالٹ کو جو دربار پونہ میں رزیڈنٹ تھا گورنر جنرل نے لکھا کہ:۔

"ہمارے مفاد کے واسطے ٹیپو سلطان سے جنگ اٹل ہے۔ اس لیے اس موقع پر مرہٹوں کی امداد و تعاون حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔"

ان تیاریوں کے متعلق سینکلر لکھتا ہے کہ:۔ "انگریزوں۔ مرہٹوں اور نظام کا ایک عہدنامہ ہوا کہ ٹیپو سلطان کی روز افزوں طاقت کو مٹا دیا جائے اور اس کا ملک۔ انگریز۔ نظام اور مرہٹوں میں تقسیم کر لیا جائے۔"

اب ایک طرف تو جو ریاستیں سلطان کے خلاف تھیں اور اس سے حسد۔ کینہ اور بغض رکھتی تھیں ان سب کو انگریزوں نے تقسیم ملک کا سبز باغ دکھا کر اپنی طرف ملا لیا اور دوسری طرف سلطان کے

ملک میں سازشوں کا جال پھیلا یا گیا اور بڑے بڑے افسران ملکی و مالی ایمان فروشی اور نمک حرامی کر کے انگریزوں کے اس جال میں پھنس گئے اور فوراً ۱۷۹۱ء میں بلا اعلانِ جنگ ہی میسور پر حملہ کر دیا گیا۔ سلطان کو اس حملہ کی اطلاع اُس وقت ملی کہ جب بنگلور کا قلعہ کشن راؤ قلعہ دار کی سازش سے انگریزوں کے قبضہ میں پہونچ گیا اور وہ سرنگاپٹم کی طرف بڑھے۔ اس سازش کے متعلق خود کشن راؤ کے الفاظ یہ ہیں "میں نے جو آگ لگائی ہے وہ سلطان کے بجھائے نہ بجھ سکے گی"

سلطان سے بد عہدی اور دغا کر کے نظام اور مرہٹے بھی انگریزوں کے ساتھ ساتھ میسور پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو گئے۔ سلطان نے ان بڑھتی ہوئی فوجوں کے مقابلے کے واسطے تو اپنے چیدہ چیدہ سرداروں کو چھوڑا اور خود سرنگاپٹم پہونچا جہاں انگریزی فوجوں نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ یہ محاصرہ عرصہ تک جاری رہا کیونکہ ابھی تک انگریز سلطانی رعایا کو ورغلانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے اور وہ بلا تخصیص مذہب و ملت ہر طرح سے اس کے ساتھ تھی۔ ان حالات میں انگریزی فوجوں کو رسد کی فراہمی میں بہت دقت ہونے لگی۔ باہر سے جو رسد آ رہی تھی اُس کو سلطان کے فوجی دستوں نے لوٹ لیا اور رسد آنے کے راستوں کو بھی روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج کے سپاہی بھوکوں مرنے لگے یہاں تک کہ باربرداری کے مویشی کاٹ کاٹ کر کھانے کی نوبت آ گئی۔

ان واقعات کو دیکھ کر کارنوالس جو بذات خود اس جنگ کی رہنمائی کر رہا تھا سخت پریشان ہوا۔ صلح جو سلطان نے پھر ایک مرتبہ صلح کے واسطے سلسلہ جنبانی کی مگر مغرور کارنوالس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس واقعہ کے متعلق ایک مسیحی مورخ کا بیان ہے کہ انگریزوں کو اس وقت سلطان سے اس درجہ بغض اور حسد تھا کہ جس طرح وحشی اقوام کو اپنے دشمنوں سے ہوتا ہے اور وہ سلطان سے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے واسطے بے چین تھے۔ مگر حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے اور کارنوالس کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر اپنی فوجیں سرنگاپٹم سے ہٹا لینا پڑیں اور متحدہ افواج مل کر ایک دوسرے کی مصیبت بٹانے اور رسد مہیا کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ رسد کے انتظامات سے جب فراغت حاصل ہوگئی اور برسات کا موسم بھی ختم ہوا تو کارنوالس نے پھر متحدہ افواج کے ساتھ سرنگاپٹم کا رخ کیا۔ جب سلطان کو معلوم ہوا کہ قلعہ داروں کی سازش کی وجہ سے انگریز بلا مقابلہ اور لڑائی کے بڑھتے چلے آرہے ہیں تو اس نے فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور سختی سے مقابلہ کرکے انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔

لیکن ہندوستان کی قسمت کا تارہ ڈوب رہا تھا اور اس کی بگڑی ہوئی قسمت کو بنانے کے واسطے اکیلا ٹیپو سلطان ہی سینہ سپر ہو کر جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ مگر اکیلا چنا کیا خاک بھاڑ پھوڑتا۔

دکن کی سب طاقتیں اس کے خلاف میدان جنگ میں اُتر آئی تھیں اس کے اپنے سردار، قلعہ دار بھی بے وفائی پر کمر بستہ تھے اور تھالی کے بینگن کی طرح روپیہ کی طاقت کے سامنے پھسلتے چلے جا رہے تھے مگر کامیابی اب بھی انگریزوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور اُن کی فوجیں پیچھے ہٹ ہٹ کر اپنا بچاؤ کرنے پر مجبور تھیں۔ ان حالات میں معاملہ بگڑتے دیکھ کر انگریزوں نے سلطان کی صلح کی اس پیش کش سے جو پہلے محاصرہ کے وقت بھیجی گئی تھی فائدہ اُٹھایا اور صلح کی شرائط سلطان کے روبرو پیش کی گئیں لیکن اب اُس نے ان شرائط کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا مگر اس کے سرداروں۔ امیروں اور وزیروں کو دی ہوئی رشوتوں نے اپنا رنگ دکھایا اور اُن سب نے یک زبان ہو کر سلطان کو انگریزوں کی پیش کی ہوئی شرائط منظور کر لینے پر مجبور کیا۔ سلطان نے اُن شرائط کو جن کو وہ پہلے ٹھکرا چکا تھا بادل ناخواستہ منظور کر لیا۔ ان شرائط کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) سلطان انگریزوں اور اُن کے ساتھیوں کو تین کروڑ روپیہ دے۔ اور

(۲) مزید تین کروڑ کا ملک اُن کے واسطے چھوڑ دے اور روپیہ کی ادائیگی تک دو شہزادے انگریزوں کے پاس بھیج دیے جائیں۔

یہ شرائط گو سلطان کے جذبہ خودداری اور آزادی کے سراسر خلاف تھیں مگر اُن کو اُس نے طوعاً و کرہاً مان ہی لیا۔ چنانچہ صلح ہو گئی اور صلح نامہ کی شرائط پر سلطان نے ایمان داری اور دیانت داری کے ساتھ جیسی کہ اس سے توقع کی جا سکتی تھی عمل کیا۔ اس کی رُو سے ایک کروڑ روپیہ تو فوراً نقد ادا کر دیا گیا اور ریاست میسور کا تقریباً نصف علاقہ سلطان کے قبضہ سے نکل کر انگریزوں۔ نظام الملک اور مرہٹوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہندوستان تباہ ہوا تو ہوا مگر نظام اور مرہٹوں کی مرادیں تو پوری ہو گئیں اور سلطان کو اس طرح مجبور اور معذور کر دینے کے بعد انگریزوں نے بھی قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

کارنوالس نے اس لڑائی میں جو حرکتیں کی ہیں اُن کے متعلق اسی کے ایک ہم وطن و ہم قوم ممبر پارلیمنٹ نے جو کچھ کہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے واسطے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :—

"کارنوالس نے لٹیروں کا ایک جتھا جمع کر رکھا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ حق داروں کا حق لوٹ رہا ہے"

مگر صدا سنتا ہے کون طوطی کی نقار خانہ میں۔ پارلیمنٹ پر اس کی چیخ و پکار کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہاں تو ہندوستان پر قبضہ کرنے اور اُس پر حکومت کرنے کا سودا سب کے سروں میں سمایا ہوا تھا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں نوابوں

اور راجاؤں کو ذرا ذرا سے اور بے سروپا الزاموں پر اُن کی ریاستوں سے بے دخل کر دیا گیا۔

اگر ان لڑائیوں کی تفصیلی روئدادیں پڑھی جائیں تو پتہ چلے گا کہ ان میں انگریزوں نے رشوت اور پروپیگنڈے سے جو کام لیا وہ اُن کے سپاہی اور ہتھیار پورا نہیں کر سکے۔ محرم کے زمانہ میں کارنوالس نے میسور کی سیدھی سادی پبلک کے سامنے وہ وہ سوانگ بھرے اور روپ گانٹھے کہ ملک بھر میں مشہور ہو گیا کہ انگریز تو حسن سلوک اور اعتقادات میں تو مسلمانوں سے بھی بہتر ہیں۔ اس طرح پبلک کے رجحانات بگڑتے دیکھ کر پیروں اور نیم ملاؤں کی بھی خوب بن آئی۔ یہ طبقہ ہر زمانہ اور سلطنت میں اپنے معتقدین کے رجحان ہی کو دیکھ کر چلتا ہے اور صحیح و غلط کا اندازہ اپنے مفاد کی بنا پر کرتا ہے۔ سلطان کی راست بازی رواداری اور خالص خدا پرستی ان کے مفاد کے خلاف تھی اور اس نے ملک میں بہت سی ایسی مذہبی اصلاحات نافذ کر دی تھیں جن سے ان نیم ملاؤں کے وقار کو دھکا لگا تھا پس انھوں نے بھی موقع پاتے ہی جی کھول کر زہر اُگلنا شروع کر دیا اور سادہ لوح پبلک اُن کے پروپیگنڈے کے سامنے ڈانواں ڈول ہو گئی۔ ادھر انگریزوں کی دولت اور وعدوں نے اس وطن و قوم فروش طبقہ کی کوششوں کو تیز سے تیز تر کر دیا پس رعیت کا

کچھ حصّہ بھی اُن کا ہم نوا ہو گیا۔

ان سب واقعات سے صاف صاف عیاں اور روشن ہے کہ سلطان کی جس ہر دل عزیزی اور رواداری نے اب تک انگریزوں کی دال نہیں گلنے دی تھی اس کو تباہ اور برباد کرنے میں اس کے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں ہی نے سب سے پہلے پیش قدمی کی اور زیادہ سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ انگریز اس نکتے کو جانتے تھے کہ ملک کو تباہ اور برباد کرنے اور غلام بنانے کے واسطے عوام کی ذہنیت کو بدلنا ضروری ہے اور ہندوستان کی پبلک کو ورغلانے میں ان ہی کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ روپیہ اور پروپیگنڈے کی بدولت ان کی یہ دقت کچھ دقت ہی نہیں رہی تھی اور ان کی حکمت عملیوں کے واسطے میدان صاف و ہموار تھا۔

یہ واقعات سلطان سے بھی پوشیدہ نہیں تھے اُس نے سب امور کا جائزہ لیا اور از سر نو اپنے بچے کھچے مقبوضات کی تنظیم پر توجّہ دی۔ سلطنت اور ملک کے انتظام کے واسطے ایک پارلیمنٹ بنائی اور اُس میں پبلک کے سربرآوردہ لوگوں کو ممبر بنایا تا کہ حکومت کے قیام اور بقا کی طرف اُن کی توجّہ مبذول ہو اور وہ سچے دل سے اس کے مددگار رہیں۔ میر صادق اس پارلیمنٹ کا صدر منتخب ہوا اور پورنیا کو وزیر مال کا معتمد اور

اہم عہدہ سپرد کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان کا یہ قدم ملک کی
ذہنی ترقی سے بہت آگے تھا اور ملک والے اس کی اہمیت کو
سمجھ ہی نہیں سکتے تھے انھوں نے اس کو سلطان کی کمزوری پر
محمول کیا۔ ادھر انگریزوں نے اس نیک اور بروقت اصلاح کے
اثرات زائل کرنے کے واسطے منصوبہ بندی شروع کر دی اور
رشوتوں کے زور سے پارلیمنٹ کے اراکین خصوصی کو خفیہ
اپنی طرف ملانا شروع کر دیا۔ اور بدقسمتی سے سلطان کے یہ
دونوں ذمہ دار وزیر یعنی میر صادق اور پورنیا سلطان سے
بے وفائی اور وطن فروشی پر آمادہ ہو گئے۔

سلطان کے دونوں شہزادے پورا تاوان جنگ ادا ہو جانے
کے بعد ۱۷۹۴ء میں میسور واپس آگئے اور ٹیپو کی رات دن کی
محنت اور جانفشانی سے اس کی سلطنت پھر سرسبز حالت میں
ہونے لگی۔ ادھر کارنوالس کے بعد سر جان شور ہندوستان کا
گورنر جنرل ہوا جو سیدھا سچا اور صلح پسند آدمی تھا اور سرنجان مرنج
کی پالیسی پر عامل تھا چنانچہ اس کے عہد میں سلطان کو اپنی ریاست
کو درست کرنے کا کچھ موقع مل گیا تھا اور اب پھر اس کی طاقت
بڑھ رہی تھی۔ سر جان کو اس کا کھلا ہوا اعتراف تھا کہ وہ سلطان
کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے میں ناکامیاب رہا تھا۔

کارنوالس کی محنت کو یوں رائگاں جاتے ہوئے اور

انگریزوں کے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب کو خواب
پریشاں ہوتا دیکھ کر انگریز بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ
انگلستان میں پارلیمنٹ کے سربرآوردہ ممبران پریشان تھے اور
ان حالات سے بالکل مطمئن اور خوش نہیں تھے۔ ادھر ان کے
سیاسی رقیب فرانسیسی بھی اپنی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے اور
ہندوستانی ریاستوں میں اپنا رسوخ بڑھا رہے تھے اور ان کی
حکومت بھی ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی۔ انگریزوں
کو اس وقت ہندوستان کے واسطے ایسے حاکم کی ضرورت تھی کہ
جو ایک طرف تو فرانس والوں سے نفرت کرتا ہو اور دوسری طرف
ٹیپو سلطان سے بھی عناد رکھتا ہو۔ ولزلی اپنے نجی معاملات کی
بنا پر فرانسیسیوں سے سخت متنفر تھا اور کارنوالس کی دوستی نے
اس میں دوسری صفت بھی پیدا کر دی تھی پس ۱۷۹۸ء میں
ہندوستان کی حکومت کا قرعہ اسی کے نام پڑا۔

جس وقت ولزلی اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ ہندوستان
میں وارد ہوا ہے تو جنوبی ہندوستان کے تینوں رئیس نظام۔
مرہٹے اور سلطان ٹیپو ہی ایسے تھے کہ جن سے انگریزوں کو کچھ
خطرہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ولزلی نے ان کو یکے بعد دیگرے اپنے
زیر اقتدار لانے کی تدابیر سوچنا شروع کر دیں۔ اس سے قبل کہ
ان تجاویز کو مختصراً بیان کیا جائے بہتر ہوگا کہ اس وقت کی

ہندوستانی سیاست کا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے
تاکہ واقعات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کے متعلق ہم ایک بیان
نقل کرتے ہیں جو ایک حیدرآبادی مصنف کی کتاب سے لیا گیا ہے
وہ لکھتا ہے کہ: "ٹیپو سلطان کے لڑکے جو ۱۷۹۲ء کے صلح نامہ
کے تحت بطور میر غمال کمپنی کے زیر نگرانی تھے اوائل ۱۷۹۴ء
میں بہ اعزاز و اکرام واپس کر دیے گئے۔ اس کے بعد سے غالباً
ٹیپو سلطان اپنی سلطنت کی وسعت کے خیال میں دُور دُور کے
منصوبے قائم کرنے لگے۔ چنانچہ وہ اپنے قلعہ جات کی ترمیم و
تعمیر کی طرف توجہ کرنے کے علاوہ دُور دُور کی خود مختار سلطنتوں
سے مراسلت کرنے لگے۔ ایران کے ایک شاہزادے ان کے
پاس آئے۔ شاہ افغانستان سے کوئی مفاہمت ہوئی اور ایک
سفیر کو خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی کے پاس روانہ کیا۔ شاہ فرانس
سے بھی ریشہ دوانی کی۔ یہ اعمال اس قابل نہیں تھے کہ وہ جماعت
یعنی کمپنی ان کو صرف نظر انداز کر جاتی جو جلب منفعت اور
ملک گیری کی خاطر اپنا وطن انگلستان چھوڑ کر ہندوستان میں
قسمت آزمائی کے لیے آئی ہو۔ انگریز کمپنی کے عہدہ داروں نے
اس کو نظر تعمق سے دیکھ کر قرار یہ دیا کہ ٹیپو سلطان انگریزوں ہی
کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی خیال
سے ان کے منصوبوں کے دفع دخل کی تیاریاں کرنے لگے۔

انگریزوں کے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب کو خواب پریشان ہوتا دیکھ کر انگریز بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انگلستان میں پارلیمنٹ کے سربرآوردہ ممبران پریشان تھے اور ان حالات سے بالکل مطمئن اور خوش نہیں تھے۔ ادھر ان کے سیاسی رقیب فرانسیسی بھی اپنی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے اور ہندوستانی ریاستوں میں اپنا رسوخ بڑھا رہے تھے اور ان کی حکومت بھی ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی۔ انگریزوں کو اس وقت ہندوستان کے واسطے ایسے حاکم کی ضرورت تھی کہ جو ایک طرف تو فرانس والوں سے نفرت کرتا ہو اور دوسری طرف ٹیپو سلطان سے بھی عناد رکھتا ہو۔ ولزلی اپنے نجی معاملات کی بنا پر فرانسیسیوں سے سخت متنفر تھا اور کارنوالس کی دوستی نے اس میں دوسری صفت بھی پیدا کر دی تھی پس ۱۷۹۸ء میں ہندوستان کی حکومت کا قرعہ اسی کے نام پڑا۔

جس وقت ولزلی اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوا ہے تو جنوبی ہندوستان کے تینوں رئیس نظام۔ مرہٹے اور سلطان ٹیپو ہی ایسے تھے کہ جن سے انگریزوں کو کچھ خطرہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ولزلی نے ان کو یکے بعد دیگرے اپنے زیر اقتدار لانے کی تدابیر سوچنا شروع کر دیں۔ اس سے قبل کہ ان تجاویز کو مختصراً بیان کیا جائے بہتر ہوگا کہ اس وقت کی

ہندوستانی سیاست کا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ واقعات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کے متعلق ہم ایک بیان نقل کرتے ہیں جو ایک حیدر آبادی مصنف کی کتاب سے لیا گیا ہے وہ لکھتا ہے کہ :۔ "ٹیپو سلطان کے لڑکے جو ۱۷۹۲ء کے صلح نامہ کے تحت بطور میر غمال کمپنی کے زیر نگرانی تھے اوائل ۱۷۹۴ء میں بہ اعزاز واکرام واپس کر دیے گئے۔ اس کے بعد سے غالباً ٹیپو سلطان اپنی سلطنت کی وسعت کے خیال میں دُور دُور کے منصوبے قائم کرنے لگے۔ چنانچہ وہ اپنے قلعہ جات کی ترمیم و تعمیر کی طرف توجہ کرنے کے علاوہ دُور دُور کی خود مختار سلطنتوں سے مراسلت کرنے لگے۔ ایران کے ایک شاہزادے ان کے پاس آئے۔ شاہ افغانستان سے کوئی مفاہمت ہوئی اور ایک سفیر کو خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی کے پاس روانہ کیا۔ شاہ فرانس سے بھی ریشہ دوانی کی۔ یہ اعمال اس قابل نہیں تھے کہ وہ جماعت یعنی کمپنی ان کو صرف نظر انداز کر جاتی جو جلب منفعت اور ملک گیری کی خاطر اپنا وطن انگلستان چھوڑ کر ہندوستان میں قسمت آزمائی کے لیے آئی ہو۔ انگریز کمپنی کے عہدہ داروں نے اس کو نظر تعمق سے دیکھ کر قرار یہ دیا کہ ٹیپو سلطان انگریزوں ہی کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی خیال سے ان کے منصوبوں کے دفع دخل کی تیاریاں کرنے لگے۔

کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے خاص اسی غرض سے مارکوئیس ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا۔ جنھوں نے مسائل ہندوستان پر غور کرتے ہوئے مرہٹوں کے مقابلہ میں نظام علی خاں کو کمک نہ دینے پر اپنے مراسلہ میں بایں الفاظ اظہار خیال کیا ہے۔
"یہ کوئی دوراندیشانہ پالیسی نہیں ہے کہ نظام اور مرہٹے آپس میں لڑکر کمزور ہو جائیں۔ دراں حالیکہ ٹیپو سلطان آرام میں ہیں"
اس سے ظاہر ہے کہ ان کے مطمح نظر صرف ٹیپو سلطان تھے۔ گورنر جنرل موصوف نے اس امر پر بھی توجہ کی کہ مرہٹوں اور نظام علی خاں کو معاہدوں کے ذریعہ اپنے قابو میں لایا جائے تاکہ وہ ٹیپو سلطان سے متفق ہو کر اس کی قوت میں اضافہ کرنے کے باعث نہ ہو جائیں۔

ولزلی بہ حیثیت گورنر جنرل ۱۷ مئی ۱۷۹۸ء کو کلکتہ پہونچے۔ یہاں آنے کے تین ہی ہفتہ بعد ان کو یہ اطلاع ملی کہ ٹیپو سلطان کے دو ایلچی فرانس پہونچے جن کے ذریعہ انھوں نے حکومت فرانس سے اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی اور اسی سلسلہ میں کچھ فرانسیسی عہدہ داروں کو بھی طلب کیا۔ جس پر وہاں سے تقریباً دو سو سپاہی مع عہدہ دار ٹیپو سلطان کے پاس روانہ کیے گئے جو منگلور کے بندرگاہ پر ۲۶ اپریل ۱۷۹۸ء کو پہونچے۔ انگریز مورخ اس فرانسیسی فوج کے آنے کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ ٹیپو سلطان

انگریزوں سے سابقہ جنگ کا انتقام لے کر اپنے سابقہ علاقہ کو
واپس حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ہم کو اس کے تسلیم کرنے میں
اس وجہ سے تامل ہے کہ سپاہیوں کی اس قلیل تعداد سے اس
سوءظن کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ یا تو انگریزی کمپنی کو نیچا دکھانے
کے لیے صرف ان ہی دو سو سپاہیوں کی کمی تھی یا یہ کہ ٹیپو سلطان کو
صرف ان ہی دو سو سپاہیوں کی امداد کی ضرورت تھی۔ یہ ضرور ہے
کہ ٹیپو سلطان انگریزوں کے موافق نہیں تھے اور عجب نہیں کہ وہ
یہ بھی چاہتے ہوں کہ نہ صرف اپنے منتزعہ حصہ ملک کو انگریزوں سے
واپس حاصل کریں بلکہ ان کو ہندوستان سے بھی نکال باہر کر دیں۔
لیکن اس نوبت پر اُن کے ان اعمال پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ
شاہ کابل و شاہ ایران سے جو مراسلت ہوئی تھی وہ مرہٹہ ریاست
کے مقابلہ کے لیے تھی۔ شاہ ترکی سے جو مراسلت ہوئی اس کا امکان
محض قومیت کے اعتبار سے تھا یا اس لیے کہ خلیفۃ المسلمین کے پاس
سے اپنی شاہی کے لیے سند طلب کریں جس کے بعد وہ مستند طور پر
اپنی ریاست کے خود مختار بادشاہ کہلائے جا سکیں کیونکہ جو امور
کہ مخالفین ٹیپو سلطان اُن کو بُرا ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے تھے
اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ بطور خود بادشاہ یا سلطان کا لقب
اختیار کیے ہوئے تھے۔ شاہ فرانس سے جو مراسلت اُنھوں نے کی
اس لیے ہو سکتی تھی کہ اپنی فوج کو زیادہ باقاعدہ اور اس کو یوروپی

اصول پر فوجی اور حربی تعلیم دلانے کے لیے سامان مہیا کریں اور اس مخالف انگریز قوم سے اس قسم کی مدد حاصل کرنے میں سہولت اسی صورت میں تھی کہ اس قوم کو یہ جتائیں کہ وہ خود بھی انگریز قوم کے افراد سے خوش نہیں ہیں۔ بہرحال ٹیپو سلطان کے ان ارادوں کو انگریزی کمپنی نے سخت بدگمانی سے دیکھا اور یہ تصفیہ کر لیا کہ جتنی جلد ہو سکے ان کے منصوبوں پر پانی پھیر کر ان کی روز افزوں قوت کو ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے۔ سب سے پہلے لارڈ صاحب نے مدراس گورنمنٹ کی فوج کو سواحل ملیبار اور کارومنڈل پر آ جانے کے احکام دیے اور اپنے اس خیال کی تکمیل و تائید میں جو بورڈ آف کنٹرول کے پریذیڈنٹ کو ظاہر کیا گیا تھا ٹیپو سلطان سے مقابلہ کرنے کی غرض سے نظام علی خاں اور مرہٹہ راجگان و پیشوا کے ساتھ ایک مزید معاہدہ کرنے کی کوشش کی تاکہ اس پیش پا افتادہ مہم میں ان دیسی ریاستوں کی فوجی قوت کمپنی کے زیر اثر آ جائے اور ان کے خود مختارانہ اقتدارات کمپنی کے صواب دید پر منحصر ہو جائیں۔"

حیدرآبادی مورخ کا یہ بیان انگریزوں کے ارادوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ہم ولزلی کے خطوط کے اقتباسات کو بھی جو نیچے لکھے جاتے ہیں دیکھیں تو اس مورخ کے اخذ کیے ہوئے نتائج اور تنقیدیں درست معلوم ہوتی ہیں۔ ولزلی

ایک خط میں مرہٹوں اور نظام علی کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"عام بدنظمی کے اس ہنگامہ زار میں تنہا ٹیپو سلطان کی طاقت ہر اختلال و نقصان سے محفوظ رہی ہے حالانکہ اس کی طاقت کو دبائے رکھنا ہمارے تمام معاہدوں اور متحدہ کارروائیوں کا حقیقی مقصد اور مدعا تھا۔"

ٹیپو سلطان کے خلاف جنگی کارروائی کرنے سے قبل دیسی ریاستوں کو اپنے زیر اثر لانے کے واسطے سب سے پہلے نظام کا انتخاب کیا گیا اور یہی سب سے زیادہ آسان لقمہ بھی تھا، کیونکہ جیسا کہ ولزلی نے ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ "موجودہ وقت میں معلوم ہوتا ہے کہ نظام ہر قسم کی قربانی دے کر ہماری دوستی حاصل کرنے پر آمادہ ہے۔" واقعہ بھی یہ ہی تھا اس آمادگی کی وجہ پر روشنی ڈالنے کی غرض سے ہم ایک اور اقتباس دیتے ہیں ایک دوسرے مورخ کے حوالہ سے باسو لکھتا ہے کہ :- "میر عالم کا عہدہ وزارت انگریزوں کا رہین منت ہے عظیم الامرا کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا مفاد میر عالم کی ذات سے ہی وابستہ تھا۔" سچ تو یہ ہے کہ بقول باسو "جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بعد عصائے سلطنت انگریزوں کے ہاتھ آیا تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عصا اُن کے ہاتھ سے بھی گر جانے والا تھا۔ ایسے وقت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو سہارا دینے والا بھی

مسلمان ہی تھا اور وہ حیدر آباد تھا۔"

چنانچہ حیدر آباد سے معاہدہ کرنے میں انگریزوں کو کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی اور وہ نہایت آسانی سے اُن کے جال میں پھنس گیا۔ البتہ مرہٹوں کا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ مرہٹوں میں اُس وقت دولت راؤ سندھیا سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر تھا، اور مرہٹوں کے سب سردار اس سے دبتے تھے۔ نظام اور پیشوا دونوں ہی اس سے ہراساں تھے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ درحقیقت ٹیپو کی نہایت بیش بہا خدمت انجام دے رہا تھا۔ اور اُن کے دفاعی اتحاد کی حقیقی غرض کو فنا کر رہا تھا۔ اس لیے انگریزوں کو صرف اسی کی طرف سے خوف تھا۔ چونکہ اس کی موجودگی میں پونہ میں انگریزوں کی دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسری طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے واسطے انگریزوں نے ہندوستان میں زمان شاہ ابدالی کے حملہ کا پروپیگنڈا کیا تاکہ سندھیا ڈر کر اُدھر متوجہ ہو جائے مگر وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھتا تھا اور ان کے اس جال میں نہیں پھنسا۔ اب انھوں نے دوسری ترکیب کی اور روپیہ کے زور سے دولت راؤ کے سرداروں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور نظام کو بھی جو اُن کا ساتھی ہو گیا تھا اُس کے خلاف اُکسا دیا۔ ان واقعات کی تصدیق نیچے دیے ہوئے اقتباس سے و نیز اُن اقتباسات سے

جو آگے دیے جائیں گے بخوبی ہوتی ہے۔

گورنر جنرل کا جو خط ریذیڈنٹ پونہ کو ۱۷۹۸ء میں موصول ہوا اُس میں مرقوم ہے کہ: "سندھیا کی طاقتور فوج کا پونہ میں رہنا ہی ہمارے مقصد کے لیے جو ٹیپو سلطان کے خلاف ہے خطرناک ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ سندھیا اور ٹیپو سلطان میں کوئی معاہدہ ہوا ہے یا نہیں۔"

مرہٹوں کی سلطنت کی سرحدیں ایک طرف تو ناگپور کے علاقہ سے ملتی تھیں اور دوسری طرف اودھ سے۔ اودھ کی سلطنت کو انگریز پہلے ہی اپنے قبضہ میں لا چکے تھے اور وہاں اُن کے ارادوں اور اسکیموں میں مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت نہ تھی البتہ ناگپور کی طرف سے ولزلی کو اطمینان کلی نہیں تھا۔ لہذا اُس نے اپنے حیدرآبادی ریزیڈنٹ کو لکھا کہ:-

"آپ کو معلوم ہوگا کہ راجہ برار کے پاس ہماری ایک سفارت جا رہی ہے۔ راجہ ناگپور کو اپنی جانب ملا لینا ہمارے مقصد کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مناسب طریقہ یہ ہے کہ حیدرآباد کے ذریعہ اس دوستی کو مستحکم کیا جائے اور ہمارے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہو جس کے ذریعہ سندھیا یا ٹیپو کے خلاف ہم کام لے سکیں۔ اس لیے تم اپنی کوشش سے ناگپور کے راجہ کے عادات اور اطوار اور اس کے خیالات دریافت کرو۔ ناگپور کو یہ حیثیت دولت راؤ سندھیا کے

سرحد ہونے کے نہایت ہی اہمیت حاصل ہے"
اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز اس حد تک تیار تھے کہ اگر سندھیا رضامندی سے اُن کا ساتھ نہ دے تو اس کے خلاف بھی فوجی کارروائی کی جائے۔ دنیا کا دستور ہے کہ جہاں طاقت ہی سچائی ہے وہاں ایسی ہی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور اکثر وبیشتر اُن کا نتیجہ زبردست کی مرضی کے موافق ہی نکل آتا ہے۔

ادھر کی طرف سے سندھیا کے خلاف اپنی دھمکیوں کو موثر بنانے کے واسطے انگریزوں نے اپنی ایک فوج اُس کی سرحد پر تعینات کر دی۔ چنانچہ ان سب حرکتوں کا نتیجہ انگریزوں کی منشاء کے عین موافق نکل آیا اور سندھیا خوف زدہ ہو کر پونہ سے گوالیار چلا گیا۔ انگریز فی الحال یہ ہی چاہتے تھے اور اس طرح پونہ میں ان کی کارروائی کے واسطے میدان صاف ہو گیا۔

نانا فرنویس اور پیشوا نہ تو دوراندیش تھے اور نہ اُن کی طاقتیں ایسی تھیں کہ وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف سر اُٹھائیں اور اُس کو روک سکیں۔ اس وقت انگریز اُن سے جو شرائط بھی چاہتے منوا لیتے اور جیسا صلح نامہ چاہتے کر سکتے تھے مگر وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے انھوں نے صرف یہ ہی مناسب اور ضروری سمجھا کہ ان دونوں مرہٹہ سرداروں میں آپس میں نفاق ہو جائے اور مرہٹوں کی سلطنت کے سب سردار ایک دوسرے

سے بدظن ہو جائیں چنانچہ جھوٹی سچی افواہیں اُڑا کر یہ مقصد بھی پورا کر لیا گیا اور یہ دونوں بڑے مرہٹہ سردار اپنے آپس ہی کے معاملات سُلجھانے میں مصروف ہو گئے اور اس قابل نہیں رہے کہ یک جا ہو کر اپنی قوت اور طاقت کا کامیاب مظاہرہ کر سکیں۔

ان کارروائیوں کے بعد انگریزوں کو یقین اور اطمینان ہو گیا کہ اگر انھوں نے ٹیپو سلطان کے خلاف فوج کشی کی تو اس کو دکن کی دیسی ریاستوں میں سے کسی سے بھی امداد نہیں مل سکتی ہے اور یہ ریاستیں انگریزوں ہی کا ساتھ دیں گی۔ اور اگر بفرضِ محال مرہٹوں نے انگریزوں کا ساتھ نہ بھی دیا تو وہ ٹیپو سلطان سے تو کسی حالت میں بھی نہیں مل سکتے ہیں۔

اندرونِ ملک سے تو انگریزوں کو یوں اطمینان ہوا بیرونی ممالک سے بھی اب ان کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ فرانسیوں کے حملہ کا خطرہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا اور انگریزوں ہی کی سیاست اور ریشہ دوانیوں کی بدولت افغانستان اپنی ہمسایہ سلطنت ایران سے دست و گریبان ہو چکا تھا پھر بھلا اس اطمینان کے وقت اور فرصت کو انگریز کس طرح ضائع کر سکتے تھے۔ چنانچہ سلطان کے خلاف ولزلی نے اپنی کوششوں کو اور تیز کر دیا۔

ادھر سر جان شور کے زمانہ سے سلطان کے تعلقات کمپنی سے

دوستانہ تھے اور اُن کو قائم اور برقرار رکھنے کے واسطے سلطان متواتر کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے واسطے اس نے ولزلی کی آمد پر اس کو بھی دوستانہ خطوط لکھے اور کمپنی سے اپنے اچھے تعلقات کی طرف اس کی توجہ منعطف کرائی مگر ولزلی کی نیت میں فتور تھا اور اس کے ارادے خراب تھے اور وہ ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی سلطان کا دشمن ہو چکا تھا اور ہندوستان آیا ہی اس لیے تھا کہ کمپنی کی ترقی کے راستہ میں جو جو روڑے ہوں اُن کو ہٹا دے۔

واقعات اور حالات سے ظاہر تھا کہ کمپنی کو اس وقت اگر ہندوستان میں کسی ریاست اور طاقت سے خوف تھا تو وہ سلطان کی طاقت تھی اور بقول سر ٹامس منرو انگریزوں کو یہ تشویش تھی کہ کہیں ٹیپو کے اعلیٰ نظام سلطنت۔ بلند مقاصد۔ حسن نظم و ضبط۔ اور ہنگامہ خیز جنگی کارروائیوں کی حرارت دوسری ریاستوں میں نہ پہونچ جائے۔ سر منرو انگریزوں کا ایک جہاں دیدہ اور آزمودہ کار جنرل تھا۔ اور ہندوستانی سیاست اور حالات کو اپنے تجربہ کی بنا پر نہایت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ان حالات کے بارہ میں اس نے بہت سے خطوط لکھے تھے۔ ہم ان خطوط سے چند اقتباسات دیتے ہیں تاکہ سلطانی حکومت سے جو خطرات انگریزوں کو تھے وہ واضح ہو جائیں اور نیز یہ بھی کہ ان خطرات کو دفع کرنے کے واسطے

وہ کیا کیا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"اگر اس ڈھانچہ کو توڑا نہ گیا تو ممکن ہے آہستہ آہستہ نظام حیدر آباد کے کسی جانشین یا دکن کے آئندہ مسلمان حکمران تک جا پہنچے۔ اگر ایک دفعہ اسے توڑ ڈالا گیا تو پھر اس کے بحال ہونے کا خطرہ نہیں۔ اسے دوبارہ قائم کرنے کے لیے حیدر علی جیسے اولو العزم انسان کی ضرورت ہوگی جو صدیوں میں بہ مشکل پیدا ہوتا ہے"۔

"جب تک ٹیپو زندہ ہے یہ وقت نہیں آسکتا۔ جب تک اس کی طاقت، توڑی نہ جائے گی توسیع تو رہی ایک طرف ہمیں ہر لحظہ اپنے موجودہ مقبوضات کے چھن جانے کا خطرہ لگا رہے گا۔ پھر جب ہمیں موقع حاصل ہو گیا ہے تو کیوں ایسے خطرناک دشمن کا خاتمہ نہ کر ڈالیں"۔

"میسور کا معاملہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ حیدر علی کی منظم و محکم حکومت اس کے فرزند کی سرکردگی میں زیادہ منظم اور طاقتور بن گئی ہے۔ یوروپی ڈسپلن کو زیادہ سختی سے رائج کیا گیا ہے۔ تمام آتش بار اسلحہ جو پہلے اجنبیوں سے منگائے جاتے تھے اب غیر ملکی کاریگروں کی نگرانی میں اس کی رعایا بنا رہی ہے"۔

"میسور دنیا کی خالص مطلق العنان حکومت ہے جس کا ہر شعبہ خواہ وہ عسکری ہو یا دیوانی بالغ نظر اور اولو العزم حیدر علی کے

جاری کردہ نظم و قاعدہ کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں نسب و خاندان کے دعاوی کے لیے گنجائش نہیں۔ تمام خود مختار سردار اور زمیندار یا تو مطیع ہو چکے ہیں یا فنا کے گھاٹ اُتر چکے ہیں۔ تمام طبقات کے ساتھ بلا امتیاز بالا و پست خالص عدل کا برتاؤ ہوتا ہے۔ کثیر التعداد کارواں فوج تیار ہے۔ ذمہ داری اور اعتماد کے تمام عہدے ایسے لوگوں کو دیے گئے ہیں جو گُم نامی سے اُٹھ کر بلند رتبہ پر پہونچے ہیں۔ ان حالات نے حکومت میں ایسی قوت اور طاقت پیدا کر دی ہے جس کی مثال سے ہندوستان اب تک خالی ہے"

"میسور کی حکومت میں اس کے بانیوں نے طاقت اور استحکام کی ایسی روح پھونک دی ہے کہ ایک کمزور اور نابالغ حکمران کے ماتحت بھی مضمحل نہ ہو گی"

ان اقتباسات میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی بلند شخصیتوں۔ ان کے اعلیٰ نظام ان کی رواداری غرضیکہ ہر بات کو کھلے ہوئے الفاظ میں سراہا گیا ہے اور میسور حکومت کے استقلال اور اس کی قوت کا بھی اعتراف کیا گیا ہے پھر بھلا ولزلی سلطان سے اتحاد اور دوستی کی تجدید کیسے کرتا۔ مگر اس نے یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ قبل از وقت سلطان کو اپنے ارادوں سے آگاہ ہو جانے دے پس وہ سلطان کے خطوط کے جوابات کو مناسب اور موزوں

بہانوں سے ٹالتا رہا اور اپنی اسکیم کی آخری کڑیوں کو درست اور مرتب کرنے میں مصروف ہو گیا تاکہ میسور پر حملہ کے وقت میسور کے فوجی اور ملکی سرداروں میں سے ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد سلطان کے ساتھ نمک حرامی کر کے انگریزوں کا ساتھ دے۔

میسور کے سرداروں کے سازشی کارناموں کی داستان طویل ہے اور اُس سے علٰحدہ ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے اس وجہ سے بہ خیال طوالت ہم اس کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں ہاں خاص خاص واقعات کا موقع بہ موقع ذکر کر دیں گے۔

جب ولزلی کو سب طرف سے اطمینان ہو گیا تو اُس نے مدراس کے گورنر کو خفیہ طور پر سلطان کے خلاف فوجی تیاریوں کے واسطے لکھا۔ مدراس کی انگریزی گورنمنٹ اور اُس کے بھائی کرنل ولزلی نے اس کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ خیال غلط ہے کہ ٹیپو سلطان کے پاس ایسی فوج ہے جو جنگ کرنے کے واسطے بیتاب ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی لکھا کہ جہاں تک تحقیقات اور معلومات کا تعلق ہے اس قسم کی خبریں بالکل بے بنیاد ہیں مگر ولزلی جانتا تھا کہ اس کا مقصد پورا ہونے کا وقت آپہونچا ہے اُدھر تو سب ہندوستانی ریاستیں اس کے اشاروں پر ناچنے کے واسطے آمادہ تھیں اور اِدھر میسور کے اندر اس کی سازشوں کا جال تیار تھا اور میسوری سرداروں سے انعامات و اکرامات کے

دعدے و عید ہو رہے تھے اور وہ بھی سلطان کے خلاف اس کو مدد دینے کے واسطے تیار تھے۔ اندرون ملک میں انگریز بھیس بدلے مذہب اور ہندو مسلم کے ناموں پر پبلک کو ورغلا رہے تھے پس موقع مناسب سمجھ کر ولزلی نے کمپنی کی افواج کو علی الاعلان تیاری کے احکامات دے دیے۔ سلطان نے اس وقت پھر رفع محبت و نیز اپنے شبہات رفع کرنے کے واسطے اس کو خط لکھا جس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اور جس سے سلطان کے ارادوں اور نیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

"میرا دلی مقصد یہ ہے کہ ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اُس کو پورا اور دوستی و اتفاق کو اور زیادہ مستحکم کروں۔ میں اس وقت یا تو محل میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں یا سیر و شکار میرا مشغلہ رہ گیا ہے۔ ان حالات میں آپ کا یہ لکھنا کہ اتحادی اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور بصورت دیگر جنگ کا اشارہ کرنا مجھے متحیر کر رہا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے یہ امید ہے کہ آپ درمیان میں کوئی ایسی بات آنے نہ دیں گے جس سے طرفین کے دل خراب ہوں"

مگر اس خط کا بھی ولزلی پر کوئی اثر نہ ہوا اور اُس نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی افواج حدود ریاست کے اندر بڑھا دیں پندرہ بیس دن کے بعد اعلان جنگ بھی کر دیا۔

اس دوران میں سلطان کے غدار وزرا اور امرا کی برابر یہ ہی کوشش رہی کہ سلطان اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت نہ ہونے پائے کیونکہ میل کا ہو جانا ان کے مقاصد کے خلاف پڑتا تھا۔ وہ سب کے سب سلطان کو یہ ہی یقین دلاتے رہے کہ انگریز میسور کے خلاف فوج کشی نہیں کر رہے ہیں لیکن جب انگریزوں کی افواج نے دو سمتوں سے سلطان کے پایہ تخت کا رُخ کیا تو سلطان کو اپنے وزرا کی بدنیتی کا صاف صاف علم ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ بھی آندھی دھاندھی بن کر انگریزوں کی فوج کی پیش قدمی روکنے کے واسطے نکل پڑا اور اُن کے سروں پر جا پہونچا۔ انگریزوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ سلطان اس قدر تیزی اور سرعت کے ساتھ غیر ہموار میدانوں اور جنگلوں میں کوچ کرتا ہوا اُن تک پہونچ جائے گا۔

بہ قول "سنکلیر" اور "میں مورخین" "سدا سر" کے مقام پر انگریزوں اور سلطانی فوجوں کا مقابلہ ہو گیا اور انگریزی فوجوں کو سخت نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن سلطان کے جن سرداروں کی سرکردگی میں یہ لڑائیاں لڑی گئیں وہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ ایک طرف تو میر قمر الدین نے بجائے انگریزی فوجوں کو روکنے کے اُلٹی اُن کی رہنمائی سرنگا پٹم کی طرف کی۔ چنانچہ ایک مورخ لکھتا ہے کہ میر قمر الدین انگریزی

فوج کے پیچھے پیچھے اس طرح آیا گویا کہ وہ بھی باربرداروں میں شامل ہے۔ دوسری طرف پورنیا اور میر معین الدین نے سلطانی فوجوں کو کٹوانا شروع کر دیا۔ یہ حالات دیکھ کر سلطان کو خود مقابلہ پر آنا پڑا۔ مگر فوراً ہی اس کو اطلاع ملی کہ دوسری سمت سے انگریزی فوجیں اس کے پایہ تخت کی طرف بڑھ رہی ہیں پس وہ بلا تاخیر مزید واپس ہوا اور اس طرح انگریزوں کی کل افواج کو بلا مزاحمت آگے بڑھنے کا موقع مل گیا اور سلطانی دفاعی مورچے یکے بعد دیگرے بلا مزاحمت دشمنوں کے قبضہ میں جانے لگے۔ سلطان نے سرنگا پٹم پہونچ کر مقابلہ کی تیاریاں کیں مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ بہ قول جنرل میڈوز انگریزوں کی فوجوں کو ہو سہلی کے محفوظ راستے سے لا کر قلعہ کے جنوب مغربی گوشہ کے عین مقابل ٹھہراتے ہوئے قلعہ کے اس سب سے کمزور پہلو کو بتلانے والا میر قاسم علی بن میل سید نورالدین اس کا اپنا ہی سردار تھا۔ اسی طرح دیگر سرداروں کی نمک حرامی [illegible] اس کو ظاہر ہونے لگی۔

فوجوں کی کامیابی افسران کی لیاقت محنت اور اُن کی دیانت اور وفاداری پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لڑائی میں نہ تو میسور کی فوج وہ فوج تھی جس نے انگریزی فوجوں کو پچھلی تین لڑائیوں میں ان ہی میدانوں میں اور اسی سرزمین پر چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا اور نہ اس کے افسران میں خلوص باقی رہ گیا تھا۔

اُس وقت تو فوج کے افسران اور سپاہی ایک جان دو قالب تھے لیکن اب افسران کی راہ اور تھی اور سپاہیوں کی اور۔ ان حالات میں نتیجہ ظاہر ہے۔

جس وقت سلطان نے اپنے سرداروں کی کونسل طلب کی اور لڑائی کے متعلق مشورہ کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر انگریزوں کی طرف جھکے ہوئے ہیں مگر سلطان کے فرانسیسی سپاہی اور افسران اب بھی اس پر جاں نثاری کے واسطے تیار تھے مگر ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ انھوں نے سلطان کو جو مشورہ دیا وہ اُن ہی کے الفاظ میں یہ تھا کہ:۔ "حضرت ہم سب کو پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیں وہ ہمارے نکل جانے سے حضرت کے ساتھ مصالحت کی گفتگو کرنے لگیں گے کیونکہ اُن کو زیادہ تر ہمارے ہی ساتھ کینہ و پرخاش ہے۔" لیکن اس مشورہ کو سن کر عالی ہمت سلطان نے جواب دیا "دوستو۔ تم غریب الوطن میری طلب پر آئے ہو اور تم نے کبھی میری رفاقت اور وفاداری میں قصور نہیں کیا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تم جیسے شریف۔ بہادر نمک حلال اور وفادار دوستوں کو دشمن کے حوالہ کر دوں۔ اگر میری تمام سلطنت تلف اور تاراج ہو جائے تو میں اس پر راضی ہوں لیکن تم کو ہرگز دشمنوں کے حوالہ نہیں کر سکتا۔"

سلطان کے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ دنیا کے

بادشاہوں کی تاریخ میں ان کی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ دوسرے
اس کا یہ خیال بھی صحیح تھا کہ اگر وہ اپنے ان رفیقوں کو انگریزوں کے
حوالے کر دیتا تو بھی باعزت صلح کا ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ ولزلی کا
خیال تھا کہ اس شہر کے ان کے قبضہ میں آجانے سے ہندوستان
کی قسمت کا دروازہ ان کے لیے کھل جائے گا اور اسی وجہ سے
اس نے اپنی افواج کے کمانڈر کو ہدایات دے دی تھیں کہ قلعہ
فتح ہونے تک کوئی شرط صلح منظور نہ کی جائے۔ چنانچہ صلح کی تحریک
پر انگریزوں کی طرف سے جو شرائط پیش ہوئیں ان میں سے ایک
شرط سلطان کی آزادی کو ختم کر کے اس کو اپنا باج گزار بنا لینا تھا
سلطان نے اس کو نامنظور کر دیا کیونکہ وہ سپاہی کی طرح لڑتے
ہوئے جان دے دینے کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتا تھا۔

اس وقت بعض بہی خواہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ
سرنگا پٹم سے بھاگ کر کسی دور دراز کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو جائے
اور وہاں سے لڑائی کی تیاریاں کرے مگر یہ بھی ناممکن العمل معلوم
ہوا۔ الغرض سلطان کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اسی قلعہ
میں رہ کر لڑائی لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر یہاں کا نقشہ جیسا کہ
اوپر لکھا جا چکا ہے بدل چکا تھا۔ انگریزوں کی متحدہ افواج چاروں
طرف سے قلعہ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اور انگریزوں کی طرف
سے برابر گولہ باری ہو رہی تھی۔ جواب میں قلعہ کی توپوں سے جو

گولے آرہے تھے اُن میں سن اور مٹی بھری ہوئی تھی۔ قلعہ کے اندر کی ذرا ذرا سی خبریں دشمنوں کو پہونچ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بہ قول ہٹن انگریزوں کے بعض افسروں کو حملہ سے پہلے ہی خفیہ طور پر قلعہ کے اندر لاکر سب اہم مقامات دکھادیے گئے تھے۔

الغرض ان حالات میں خاص حملہ کا دن بھی آ ہی گیا اور سلطان کے نمک حلال جاں نثاروں نے سلطان اور اُس کی آن پر قربان ہونا شروع کر دیا۔ سلطان صبح ہی سے بہ نفس نفیس قلعہ کے کمزور مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ دوپہر کو کھانا ابھی ایک درخت کے سایہ میں منگوا کر کھانا چاہا مگر ایک اور صرف ایک ہی لقمہ مُنھ میں گیا تھا کہ ایک جاں نثار کی شہادت کی اطلاع ملی۔ دوسرا لقمہ جو ہاتھ میں تھا ویسے ہی رکھ دیا اور جو سردار اس وقت موجود تھے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:۔

"اس غداری کا نتیجہ تمھیں اُس وقت معلوم ہوگا کہ جب تم اور تمھاری آئندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہوکر ایک ایک دانہ چاول اور ایک ایک گٹھی پیاز کو ترسیں گی"

ان الفاظ کی صداقت کو ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور جیسی کہ سلطان نے پیشین گوئی کی تھی حرف بہ حرف پوری ہوئی بلکہ حالات اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگئے اور ملک و قوم انگریزوں کی غلام ہوکر انسانیت کے ذلیل ترین درجہ پر پہونچ گئی۔

الغرض سلطان اپنی تلوار و بندوق لے کر کھڑا ہو گیا اور گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ قلعہ کی فصیلوں پر سلطان کے جان نثار قدم قدم پہ انگریزی فوج کے سپاہیوں کو روک رہے تھے، اور داد شجاعت دے رہے تھے کہ پورنیا کا وہ حکم جس کی مثال دنیا کی کسی لڑائی کی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی ہے سپاہیوں میں گشت کر گیا۔ حکم یہ تھا کہ آؤ اور اپنی اپنی تنخواہ لے جاؤ۔ اس حکم کے پاتے ہی سپاہی مورچوں پہ سے ہٹنے لگے اور بالآخر وہ خالی ہو گئے انگریز جو بہت دیر سے اس موقع کے منتظر تھے۔ قلعہ سے اشارہ پاتے ہی فصیل پہ چڑھ کر قلعہ میں داخل ہو گئے۔ قلعہ میں داخلہ اور فصیل پہ چڑھتے وقت بھی سلطان کا ایک مسلمان افسر دشمنوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر جنرل میڈوز کے الفاظ میں سنیے وہ لکھتا ہے کہ "دوپہر کا وقت تھا جب حملہ کی سب تیاریاں مکمل ہو چکیں تو جنرل بیرڈ انگریزی فوجوں کو خندقوں سے لے کر نکلا اور دریا پار ہو کر فصیل پر چڑھا۔ انگریزی فوج میں جو شخص سب سے اول تھا وہ جنرل بیرڈ تھا مگر اس کی رہنمائی کے لیے ایک اور شخص اس سے بھی آگے تھا اور وہ میر قاسم علی تھا جو فصیل قلعہ پہ بیرڈ سے بھی آگے چڑھا۔"

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ قلعہ پہ انگریزوں کا قبضہ کرانے اور ان کو بلا مزاحمت قلعہ میں داخل کرانے میں میسوری افواج

سرداروں اور افسران ہی کا ہاتھ تھا۔ افسوس۔ ع
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ظاہر ہے کہ ان حالات کا ٹیپو تو کیا دنیا کا کوئی بہادر سے بہادر انسان بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور ٹیپو نے جس طرح مقابلہ کیا وہ بھی دنیا کی تاریخ میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔

الغرض جب سلطان دسترخوان سے اُٹھ کر اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ بڑھا تو اُس نے قلعہ کی فصیل پر آنے والی انگریزی فوج کو دست بہ دست لڑائی لڑ کر پیش قدمی کرنے سے روک دیا مگر سلطان تو اکیلا ہی تھا اور وہ اپنی جرأت اور دلیری کے حیرت انگیز کرشمے ایک ہی طرف تو دکھا سکتا تھا۔ دوسری طرف جہاں سے پورنیا نے فوجوں کو ہٹا لیا تھا وہ سمت غداروں کی نمک حرامی کی وجہ سے انگریزوں کے قبضہ میں پہونچ گئی، اور ان کی فوج سلطان پر جو اپنے مورچہ پر انگریزی فوجوں کو گھنٹوں سے روکے کھڑا تھا گولیوں کا مینھ برسانے لگی۔ سلطان نے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے مخصوص دروازے میں داخل ہونا چاہا؛ تاکہ دشمنوں کی گولیوں کی زد سے بچ جائے مگر واپسی کے اس دروازہ کو نمک حرام میر صادق نے پہلے ہی مقفّل کر دیا تھا سلطان کو مجبوراً فصیل ہی پر رہنا پڑا یہاں تک کہ اب اس پر تین اطراف سے گولیوں کی بوچھار ہونے لگی اور وہ محصور ہو گیا۔

سلطان کو اس طرح ہر طرف سے گھرا ہوا دیکھ کر اس کے ایک ہمراہی امیر نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے تئیں انگریزوں پر ظاہر کر کے گرفتار ہو جائیں لیکن سلطان نے اس وقت جو جواب دیا وہ اب ہندوستان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے انسان کی مُردہ رگوں میں زندگانی کی لہر دوڑ جاتی ہے سلطان نے فرمایا کہ :۔ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے" ظاہر ہے کہ سلطان نے ذلت کی زندگی پر با عزّت موت کو ترجیح دی اور یہی وہ سبق ہے کہ جو ہم کو اس کی قبل از وقت موت سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو انگریزوں سے ان کی پیش کی ہوئی شرائط پر صلح کر سکتا تھا اور اس طرح انگریزوں کی سیادت میں اس کو سلطنت بھی واپس مل سکتی تھی، اور اس کی جان عزیز بھی بچ جاتی مگر وہ شیر دل انسان تو اس جینے کو گیدڑ کی زندگی خیال کرتا تھا اور اسی وجہ سے اُس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور وہ موت پسند کی جو شیروں کی ہوتی ہے

قصہ مختصر دوپہر سے شام تک تقریباً چھ سات گھنٹے دست بہ دست لڑائی لڑنے کے بعد ہمارا ہیرو صرف ۴۸ سال کی عمر میں ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو اپنے ملک اور اپنی آن پر نثار ہو گیا" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ " اور انگریز ہندوستان پر حکومت کرنے اور اس کو غلام بنانے کے واسطے آزاد رہ گئے۔

جب قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو سلطان کی تلاش
شروع ہوئی۔ قلعہ اور سلطانی محل کا چپہ چپہ ڈھونڈھ ڈالا گیا
مگر سلطان کا کہیں پتہ نہیں ملا کس کو خیال تھا اور کون جانتا تھا
کہ سلطان اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے واسطے اس طرح لڑتا
ہوا جام شہادت نوش کرے گا۔

آخرکار نشان وہی پر لاشوں کے انبار میں سے سلطان کی لاش
نکال کر محل سلطانی میں بھجوا دی گئی۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ سلطان کے ساتھ اس دست بدست
جنگ میں پانچ ہزار جاں نثاروں نے اپنے نامور آقا کا ساتھ دیا۔
اور بعض روایات سے مقتولین کی تعداد بارہ ہزار قرار پاتی ہے،
مگر سب مورخین اس روایت پر متفق ہیں کہ سلطان کی لاش کے قریب
ہی بے شمار عورتوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے
لباس۔ وضع اور قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ حرم سلطانی ہیں۔

اس روایت کے راوی زیادہ تر انگریز اور عیسائی مورخین ہیں
اس وجہ سے ہم کو اس کے باور کرنے میں مطلق پس و پیش نہیں ہو سکتا
ہے۔ ہمارے ملک کے بچوں اور بچیوں کے واسطے یہ کیسی سبق آموز
داستان ہے۔

صنف نازک اس واقعہ پر کہ حرم سلطانی کی پردہ نشینان عفاف
اس آخری وقت میں آبروئے وطن و ملت کی خاطر اپنی جان دیے

کے لیے آمادہ ہو کر میدان جنگ میں آئیں اور اُس کی حفاظت میں اور اُس کو غلامی سے بچانے کے واسطے اپنی زندگی اور خون کی بھینٹ چڑھائی جتنا فخر کریں کم ہے۔

آج بیسویں صدی میں اگر ایک عورت بھی اپنے ملک کی خاطر ایسی قربانی کرتی تو دنیا کی تاریخ میں اس کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جاتا اور اس کی شہرت کے ڈنکے بج جاتے۔ لیکن آہ! ہندوستان کی یہ "بے شمار" دیویاں اب سے ڈیڑھ سو سال قبل اپنے ملک پر یوں میدان جنگ میں داد شجاعت دیتی ہوئی فدا ہوتی ہیں اور تاریخ ان کے نام حسب و نسب بتانے سے بھی قاصر ہے۔ کاش تاریخ لکھنے والا کوئی آزاد اور آزادی پسند انسان ہوتا اور وہ تاریخ آزاد قوموں کے واسطے لکھی جاتی۔ بہ قول "انیس جان کنگ" جو لاشوں کے اُٹھوانے پر معمور تھا میدان میں سلطان کے ساتھ شہید ہونے والی مستورات میں ایک برہمن لڑکی بھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وطن پر فدا ہونے والوں میں مذہب اور ملت کی کوئی قید نہ تھی۔

سلطان کی شہادت کے متعلق ہم "میڈو ٹیلر" کا بیان نقل کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ:- "سلطان قریب ایک بجے کے محل سے باہر نکلا اور شام کے ۷ بجے تک میدان جنگ میں دست بہ دست لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ اس تمام عرصہ میں دھوپ کی شدت سے

اس کا بُرا حال رہا۔ ایک طرف تو ماہ مئی کی چلچلاتی دھوپ اور دوسری طرف دشمنوں سے دست بہ دست جنگ اس کی تشنگی کو لحظہ بہ لحظہ بڑھاتی رہی۔ اس نے بار بار اپنے غلام سے پانی طلب کیا۔ چھاگل موجود تھی لیکن ایک قطرہ پانی نہ دیا گیا۔ چند منٹ گزرتے ہیں پھر پیاس لگتی ہے۔ سلطان پلٹ کر راجہ خاں سے کہتا ہے "خدا کے لیے ایک قطرہ پانی" لیکن پانی نہیں ملتا سلطان کا باڈی گارڈ سلطان پر نثار ہوجاتا ہے۔ کوئی باقی نہیں رہتا۔ سلطان یکہ و تنہا رہ جاتا ہے۔ ایسے وقت راجہ خاں بھی سلطان کو چھوڑ کر زخمیوں کے انبار میں پناہ لیتا ہے جس کے تھوڑی دیر بعد سلطان کے سینہ میں گولی لگتی ہے۔ سلطان غش کھا کر گرتا ہے۔ اس سے پہلے ہی ہنگامہ کی شدت میں شاہانہ پگڑی سر سے گر جاتی ہے اس لیئے انگریزی فوج کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سب سے آخر میں گرنے والا کون تھا۔"

قلعہ کی تسخیر اور سلطان کی شہادت کے بعد کے حالات ہمارے نفس مضمون سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے ہیں اس وجہ سے بوجہ طوالت ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں اور سلطان کی تجہیز و تکفین۔ شہر کی لوٹ کھسوٹ اور اس کی سلطنت کے ختم ہو جانے پر انگریزوں نے جو خوشیاں منائیں اُن کا مختصراً حال بیان کر کے اس دل خراش داستان کو ختم کرتے ہیں۔

اس داستان کے لکھنے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن جن واقعات کو جملہ مورخین نے خواہ وہ دیسی ہوں یا بدیسی عیسائی خاص اہمیت کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے اور اُن سے کچھ نتائج بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں ہم بھی اُن کو ان مورخین ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

جنرل ہارس کو جب سلطان کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ خوشی کے مارے بے اختیار ہو کر چلا اُٹھا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے" واقعہ بھی یہ ہی ہے کہ سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کو ہندوستان پر قبضہ کرنے میں زیادہ دقت اُٹھانا نہیں پڑی اور رفتہ رفتہ سارا ملک اُن کے زیر اقتدار آ گیا۔

سلطان کی تجہیز و تکفین کے وقت کا بیان کرتے ہوئے 'لوئیس' اور 'بورنگ' اس طرح لکھتے ہیں کہ:- "اس وقت ایک طرف تو قلعہ سے ماتمی توپیں سر ہو رہی تھیں اور دوسری طرف بجلی کی چمک اور بادل کی نہایت خوفناک گرج سے اس عبرتناک واقعہ کی سنجیدگی اور بھی دوبالا ہو گئی تھی"

"جنرل میڈوز ٹیلر" نے ان واقعات کو ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عوام الناس کو ان کے ہر دل عزیز بادشاہ کی شہادت نے کیسا بے خود کر دیا تھا وہ لکھتا ہے کہ:- "رات ختم ہو گئی۔ صبح ہوئی۔ رات بھر شہر میں

خوف وہراس چھایا رہا۔ ہر جگہ بندوقوں کی آوازا اور مجروحوں کی چیخوں اور ستم رسیدوں کی آہ وفغاں کی آوازیں آتی رہیں۔ رات بھر شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری ہوتی رہی۔ سلطان کی لاش زخمیوں اور مُردوں کے ڈھیر میں شب ہی کو مِل گئی تھی غسل دے کر اس کو خاص مکّہ کے بنے ہوئے کپڑوں کا کفن دیا گیا۔ قریب چار بجے کے جنازہ اُٹھایا گیا۔ انگریزی فوج جو کل تک سلطان کے خلاف صف آرا تھی آج شہر کے راستوں پر جہاں سے جنازہ گزرنے والا تھا دو رویہ صف بستہ تعظیم کے واسطے کھڑی تھی۔ جنازہ کے آگے چار انگریزی کمپنیاں تھیں۔ جنازہ کے ہمراہ سلطنت کے اعیان واُمرا اور جنازہ کے پیچھے شہزادہ عبدالخالق سلطان کا دوسرا شہزادہ برہنہ سر گھوڑے پر سوار تھا۔

جنازہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ راستہ میں ہزارہا لوگ انتہائے غم سے نالاں وگریاں تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی سیکڑوں آدمی جنازہ کے آگے لیٹ جاتے تھے۔ بلا تفریق مذہب ہندو اور مسلمان عورتیں سروں پر مٹی ڈال ڈال کر ماتم کرتی تھیں اس طرح جنازہ قلعہ سے نکل کر شہر میں ہوتا ہوا مقبرہ تک پہونچا اور ہر ہر قدم پر آدمیوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔

آج کا دن خصوصاً حد درجہ گرم تھا۔ ہوا تمام دن بند رہی۔

ایک پتہ تک کہیں نہیں ہلتا تھا۔ آسمان پر سیاہ اور ڈراؤنے بادل چھائے ہوئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک قسم کی گہری اور مہیب آواز آتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر بھی کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ اس گرمی کی سختی کو محسوس کر رہے تھے۔ فضا کے بھیانک پن سے دلوں پر ایک رُعب چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سر اٹھاتا تو جلدی ہی خوف سے سر نیچے کر لیتا۔

اسی حالت میں جنازہ لال باغ تک پہونچا۔ ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ لوگوں کی گریہ وزاری کی آواز تمام فضا میں گونج رہی تھی۔ قلعہ سے ماتمی توپیں چھوٹ رہی تھیں مگر ان کی آواز لوگوں کی گریہ وزاری میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس ہنگامۂ غم و الم میں اگر کبھی ایک لمحہ کے لیے وقفہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ آسمان پر بھی کچھ ہو رہا ہے۔ تمام آسمان پر بجلیاں ایک گوشہ سے نکل کر دوسرے گوشہ کی طرف پیہم جا رہی تھیں۔

جنازہ عین مقبرہ کے روبرو پہونچا بینڈ بجنا تھم گیا۔ جنازہ کے آگے چار کمپنیاں جو جلو میں تھیں دو رویہ صف باندھ کر کھڑی ہو گئیں کہ جنازہ ان کے درمیان سے قبر میں لے جایا جائے۔ جنازہ آہستہ آہستہ لا کر اُتارا گیا اور خطیب اور دوسرے لوگ قطاریں باندھ کر نماز کے لیے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔

خطیب کی آواز نہایت زوردار تھی جیسے ہی اس کی زبان سے تکبیر کہنے کے لیے لفظ "اللہ" نکلا تو معلوم ہوا کہ آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر رہا ہے۔ ایک ہیبت ناک کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی اور ایک زور کی روشنی سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ایک زبردست گرج نے دلوں کو ہلا دیا اور یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ خطیب کی زبان سے "اللہ" کے بعد کوئی لفظ بھی نکلا یا نہیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک خاموشی طاری رہی۔ نماز ختم ہو چکی لاش کو اس کی آخری آرامگاہ میں رکھا گیا اور جوں ہی لاش رکھ کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا گیا پھر ایک بجلی چمکی ایک کڑک ہوئی۔ لوگوں پر لرزہ طاری ہو گیا اور یہ معلوم نہ ہوا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد بجلی اور گرج کا ایک مہیب سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی تک بارش کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ اترا تھا۔ کالی گھٹا سے معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر اترنے والی ہے۔ بجلی کی چمک سے زمین آسمان ایک ہو رہے تھے اور لوگوں کی نظریں خوف و ہراس سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ اس وقت ظاہر ہو رہا تھا کہ قدرت کے آگے انسانی طاقت کتنی حقیر ہے۔

درحقیقت آفرینندۂ خلق کی آواز اس وقت سنائی دے رہی تھی۔

فوج کو حکم دیا گیا کہ آخری سلامی اتارے۔ ادھر بندوقیں چھوٹیں اور ادھر آسمان سے ہزارہا توپیں چھوٹنا شروع ہو گئیں

جن کی آواز میں بندوقوں کی آواز بالکل دب کر رہ گئی۔ اور معلوم بھی نہ ہوا کہ فیر کے بعد جو بینڈ باجہ بجا وہ کس قسم کا تھا۔ گویا بینڈ کی آواز حقیقت میں آسمانی آوازوں کا ٹھٹھہ ہو رہا تھی"

اسی واقعہ کے متعلق میجر بٹسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ: "سرنگاپٹم کے قاضی کو سلطان کی تجہیز و تکفین کا انتظام سپرد کیا گیا۔ شاہی پالکی کو جنازہ کے واسطے تیار کیا گیا۔ محل کے تمام لوگ جنازہ کے ہمراہ شریک تھے۔ چار انگریزی کمپنیاں آگے آگے تھیں اور شہزادہ عبدالخالق پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ قاضی آیات قرآنی پڑھتا تھا اور لوگ دہراتے تھے۔ جنازہ شہر کی گلیوں میں گزرا۔ ہزارہا لوگ راستہ میں کھڑے زور و شور سے آہ و زاری کرتے تھے اور بعض جنازہ کے آگے لیٹ جاتے تھے۔

میر عالم مع چند حیدرآبادی افسروں کے مقبرہ کے پاس آ کر ملا۔ جب نماز ختم ہو گئی تو لاش کو مقبرہ میں نواب حیدر علی کے بازو میں دفن کر دیا گیا۔ پانچ ہزار روپیہ فقرا میں تقسیم کیے گئے۔ اس سانحہ کو دوبالا کرنے کے لیے ایک سخت اور مہیب طوفان آیا۔ بارش، گرج اور بجلی غضب ڈھا رہی تھی۔ انگریزی کیمپ پر بجلی گری جس سے دو افسر اور چند سپاہی ہلاک اور بہت سے زخمی ہو گئے"

سلطان کی شہادت پر آسمانی قہر و جلال کا حال آپ کو اوپر کے بیانوں سے معلوم ہو گیا۔ آئیے ذرا یہ بھی سنتے جائیے کہ تہذیب اور

شائستگی کے ان علم برداروں نے جو سلطان شہید کو ظالم۔ جابر۔ غاصب متعصب اور نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں اس کی مظلوم رعیت کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا اور کیا کیا ظلم توڑے۔ سب مورخین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ انگریزی سپاہ نے کسی چھوٹے۔ بڑے۔ امیر غریب۔ وزیر و سردار کو نہیں چھوڑا جس کا مکان لوٹ کھسوٹ سے بچا ہو یہاں تک کہ وہ غدار ملک و ملت بھی جنھوں نے انگریزوں کی رہنمائی کر کے قلعہ پر اُن کا قبضہ کرایا تھا افسران اور سپاہیوں کی دست درازیوں سے محفوظ نہ رہ سکے اور پناہ مانگنے لگے۔ ان کے گھر اور زنان خانے لوٹے گئے اور اُن کی کھلے بازار بے حرمتی ہوئی اس طرح ان میں سے اکثر کو تو اُن کی قوم فروشی کی سزا شہادت کے تھوڑی ہی دیر بعد مل گئی۔ شہر میں چار دن تک لوٹ مار ہوتی رہی جس کا مختصر حال جو کرنل ولزلی نے جنرل ہارس کو لکھا ملس نے اپنی تاریخ میں ان الفاظ میں درج کیا ہے:۔

"سرنگاپٹم کے زوال کے بعد وہاں کی رعایا پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا کہ اس کے آگے ٹیپو سلطان کے مفروضہ مظالم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ ظلم و ستم کرنے والے سپاہی انگریزی تھے یہاں تک کہ کرنل ولزلی نے جنرل ہارس کو تحریر کیا کہ انگریزی حاکم شہر کو میرے پاس بھیج دیں کہ میرے حکم کے تابع رہے۔ جب تک چند لوٹنے والوں کو پھانسی نہ دی جائے گی اس وقت

تک لوٹ کا روکنا محال ہے۔ اس وقت ہماری رجمنٹوں کے سپاہی اور جنرل اسٹوارٹ شہر میں ہیں اس کی وجہ سے اور زیادہ خوف اور دہشت پھیل رہی ہے جب تک ہم موثر ذرائع اختیار نہ کریں گے لوگ اپنے اپنے مکانات کو واپس نہ آئیں گے"

اسی کرنل نے اپنے بھائی گورنر جنرل کو جو لکھا اس کا جستہ جستہ انتخاب دیا جاتا ہے: "چار مئی کی شب میں سرنگا پٹم پر جو مصیبت آئی اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شہر میں مشکل سے کوئی مکان لوٹ سے بچا ہوگا"

"فوج کا ہر شخص بلکہ جنرل ہارس تک اس کے لیے مضطرب ہے کہ مال غنیمت جلد از جلد تقسیم ہو جائے۔ فتحمند فوج جس کو اور کوئی کام نہیں ہے بالکل قابو سے باہر ہو رہی ہے"

"مال غنیمت کی تقسیم کے لیے جو ایجنٹ مقرر کیے گئے ہیں وہ جونکوں سے زیادہ خونخوار ہیں۔ انھوں نے سلطان کے محل کے دروازے اور سلطان کے لباس اور کپڑوں تک کو فروخت کر دیا ہے اور ابھی ان کے پاس سلطان کے ملبوسات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ وہ کپڑے ہیں جو سلطان کے استعمال میں تھے اور وہ پہنا کرتے تھے۔ اگر ان کے فروخت کی فوراً ممانعت نہ کی گئی تو مجھے خوف ہے کہ اس جگہ کے وہ مسلمان جو ہمارے قبضہ سے بیزار ہیں ان کپڑوں کو بطور نشانی اور تبرک خرید لیں گے۔ یہ ہمارے لیے

ایک شرمناک بات ہو گی۔"

سلطان کے خزانہ اور محل میں دولت اور سامان کے جو انبار لگے ہوئے تھے وہ حد حساب و شمار سے باہر تھے اُن کی تفصیل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان کی سلطنت کس قدر سرسبز حالت میں تھی۔ اب تو ہم اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے صرف ایک تاجدار کے پاس اتنی دولت نکل سکتی ہے۔ مورخین کے جو بیانات اس کی تفصیل کے متعلق ہم پیش کرتے ہیں اُن ہی سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ انگریزوں نے سلطان کے خزانے۔ قلعہ اور اُس کی ذاتی ملکیت کو کیسی بے دردی کے ساتھ لوٹا اور حصہ بخرے کر کے کھا گئے۔

ان ہی بیانات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی حفاظت اور ترقی کے واسطے سلطان کے عزائم کیا کیا تھے اور وہ اپنی افواج کو کس طرح مسلح رکھتا تھا۔ اور اس نے اسلحہ جات کے بنوانے اور غلہ وغیرہ کے فراہم کرنے اور اس کو اچھی حالت میں رکھنے کے واسطے کیا کیا تدابیر کی تھیں۔ اور ان میں وہ کس حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ کاش پورے ہندوستان کی قسمت میں ایسے ہی بادشاہ ہوتے یا انگریز ہی اس کا عشر عشیر ہی ہندوستان کے واسطے کرتے جو سلطان نے باوجود ان مشکلات کے جو اس کو دم مارنے کی مہلت بھی نہیں

لینے دیتی تھیں اپنی سلطنت میں کیا تھا تو آج نہ تو ہم بھوکوں مرتے اور نہ ننگے رہتے۔ ملک کی اقتصادی حالت بھی ایسی ہوتی کہ ہندوستان کو دوسرے ملکوں کے آگے ذرا ذرا سی چیزوں کے لیے دست سوال دراز کرنا نہ پڑتا۔

ماڈرن میسور کا مصنف اس سامان کی تفصیل اس طرح دیتا ہے :—

"مال غنیمت کے تقسیم کرنے پر جو جماعت مامور تھی وہ محل کی دولت دیکھ کر حیران اور ششدر ہو گئی۔ لاکھوں جواہرات کے علاوہ سونے اور چاندی کی سلاخیں۔ زیورات اور نہایت قیمتی اور نایاب چیزیں محل کے اندر رکھی ہوئی تھیں۔ زنانہ حصہ کے سوا محل کی تمام عمارت اور دربار کا کمرہ ان چیزوں کے رکھنے کے لیے استعمال میں لایا گیا تھا۔

جواہرات مقفل صندوقوں میں تھے جو محل کے اندر تاریک کمروں میں رکھے ہوئے پائے گئے۔ یہ جواہرات جن صندوقوں میں تھے اُن پر حیدر علی اور سلطان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اسی طرح سونے کی سلاخ اور زیورات جن کی خوبصورتی بیان ہی نہیں آسکتی ایک۔ دوسری جگہ سربمہر صندوقوں میں رکھے ہوئے ملے۔ زیورات میں بازوبند۔ انگوٹھیاں۔ گلوبند اور سر کی آرائش کی بے شمار چیزیں تھیں۔ اوپر کے کمرے میں چاندی کی سلاخیں او

اس سے بنی ہوئی چیزوں کے ذخیرے تھے۔ ایک جگہ دو ہودے تھے جو پورے کے پورے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ بہت سے چاندی کے بڑے بڑے طبق تھے جن میں ہیرے اور دوسرے جواہر لگے ہوئے تھے۔ ہتھیار ایک کمرے میں تھے اس میں کئی بندوقیں اور تلواریں تھیں جن میں سونا اور جواہرات لگے ہوئے تھے ہاتھی دانت کے دروازے اور دوسری کئی قیمتی بڑی بڑی اشیا بھی محل کے اندر پائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ نہایت قیمتی فرنیچر اور بے شمار بیش قیمت قالین بھی تھے۔

نہایت عمدہ ململ۔ رباطھن۔ ریشم۔ شال اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی گٹھریاں بندھے بندھائے رکھے تھے۔ جن کا اندازہ کیا گیا کہ پانچ سو اونٹ ان کے اٹھانے کے واسطے درکار ہوں گے۔

مال غنیمت میں دوربینیں اور دوسرے شیشے ہر آنکھ کے لیے موزوں اور مختلف قد و قامت کے آئینے اور بے شمار تصاویر تھیں اور اس قدر کانچ اور چینی کے ظروف تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑی سے بڑی دوکان ہے۔

ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں نہایت قرینے سے کتابیں رکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں کی جلدیں ہیرے و جواہرات سے مرصع تھیں۔ ایک اور کمرے میں نہایت ہی قیمتی ہودہ اور

تحفتہ رکھا ہوا تھا۔

محل سے ملحق بیس اناج کے مخزن اور سات گودام تھے۔ جن میں دھان، راگی، گرم مصالحہ بھرا ہوا تھا۔ ایک گودام میں گیارہ سال آگے کے دھان رکھے ہوئے تھے جو نہایت عمدہ حالت میں محفوظ تھے۔ قلعہ میں ایک ہزار توپ۔ پانچ لاکھ گولیاں بارہ ہزار گولے اور ساٹھ ہزار بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان توپوں میں اکیاون توپ انگریزی ساخت کی تھیں باقی سلطانی کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق جب تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ساخت کے لحاظ سے بالکل اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

اس مال غنیمت میں سے ٹیپو سلطان کی ایک تلوار تو جنرل بیرڈ کو بطور انعام دی گئی اور دوسری لارڈ ولزلی کو۔ اس کے علاوہ لارڈ ولزلی کو ایک ہیروں کا جھومر اور تھوڑے زیورات تحفتہً بھیجے گئے۔ سلطان کی پگڑی اور ایک تلوار لارڈ کارنوالس کو بطور تحفہ بھیجی گئی۔ مال غنیمت میں جنرل ہارس کے حصہ میں ایک لاکھ بیالیس ہزار نو سو دو اشرفی آئی جن کی قیمت موجودہ شرح تبادلہ سے ساڑھے بارہ لاکھ روپیہ ہوتی ہے"

قلعہ کی دولت و حشمت کے متعلق آپ ایک تاریخی بیان ملاحظہ کر چکے۔ اگر اس کی لوٹ کھسوٹ کے چشم دید حالات آپ سننا پسند کرتے ہیں تو لیجیے وہ بھی پیش کیے جاتے ہیں "میجر پرائس" جو

خود اس لوٹ میں شامل تھا لکھتا ہے کہ :

"سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ اور سامان کو (جس کی مجموعی قیمت ۲۵ لاکھ پونڈ تھی) موقع پر ہی تقسیم کر لیا جائے۔ جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کا لحاظ اور اندازہ لگا کر اسے مال غنیمت میں سے حصہ دے دیا جائے۔ اس تقسیم کے لیے ایجنٹ مقرر کر دیے گئے۔ میں بھی اسی ٹیپو کی دولت دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دیکھا نہیں جاتا تھا کہ ناقابل یقین دولت اور لاتعداد زر و جواہر قلعہ میں کہاں سے آ گئے۔ مختلف قسم کے پارچہ جات اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیا سونے چاندی کے ظروف اور جواہرات و موتیوں کے بے مثل و لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے۔ ہماری عقل حیران تھی۔ فرد حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے سپاہی اور توپچیوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر چمپت بنے تھے۔

شہر میں بھی ہر شخص نے (خواہ وہ ہندوستانی افسر تھا یا یورپین) خوب لوٹ مار کی۔ بیسیوں گھروں میں جا کر روپیہ چھین لیا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پردہ اور کپڑے بیچے جس میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا اور بعض زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے

جوہری بھی قاصر تھے۔ اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر میں سے چُرائے تھے اور اپنی رجمنٹ کے ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم پر فروخت کر دیے تھے۔

تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ تمام جواہرات اور زیورات کو میز پر پھیلا دیا گیا تھا اور ڈھیریاں بنا دی گئی تھیں پھر ہر ڈھیری کی قیمت ایک جوہری کے ذریعہ تخمینہ کرائی گئی جس کے بعد یہ چیزیں افسروں کو تقسیم کر دی گئیں۔ سوائے لارڈ ہیرس کے جو کہ کمانڈر انچیف تھا، باقی تمام افسر میز کے گرد بے تابی کے ساتھ جمع ہو گئے۔ لارڈ صاحب اپنی بڑی پوزیشن کی وجہ سے نہیں آئے مگر اُن کا حصہ خیمہ میں بھجوا دیا گیا۔

لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں ایک وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت (۱۳۵۰۰) تیرہ ہزار پانچ سو پونڈ بتلائی جاتی ہے۔

سر ڈیوڈ بیرڈ کو اس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قیمت پچاس ہزار تھی۔ مگر اس نے اُس وقت غصہ میں آ کر اُسے پھینک دیا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے ایک سپاہی نے اُٹھا کر پانچ ہزار میں فروخت کیا۔

میجروں کو جواہرات تقسیم کرنے کے بعد باقی جواہرات اور قیمتی اشیا دیگر افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔

ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو

خالص سونے کی چادروں کا تھا۔ اس کے پشتہ پر ایک ہما کی تصویر تھی جو سونے اور جواہرات کی بنی ہوئی تھی۔ تخت چار سونے کے شیروں کی پشت پر قائم تھا۔ اس تخت کے ٹکڑے کرکے ڈھیر لگا دیے گئے تھے۔ اٹھارہ سو پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے۔ تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کردی گئی جو اس کے بعد اس سے سہ گنی قیمت پر علیحدہ ٹکڑوں کی صورت میں فروخت کردی گئی۔

اس تخت کے سامنے کے دو شیر جو ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیے گئے۔ اس کے ساتھ کچھ ہیرے، جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کردیے گئے۔

یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا۔ ہر سپاہی کو جسے پرائیوٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ تو ضرور مل گئے لیکن انھوں نے پرائیوٹ طور پر کافی روپیہ پیدا کرلیا۔ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بیچے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض سپاہیوں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ایک شراب کی بوتل کی خاطر کئی کئی سو روپیہ کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے دام بیچ ڈالے۔

ان تفصیلات سے جو سرکاری کاغذات کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں انگریزوں کے

محلات - اودھ کے شاہی خاندانوں - دہلی کے بادشاہ اور پنجاب کے طاقتوں اور سندھ کے امیروں - راجپوتانہ کی ریاستوں اور دیسی راجدھانیوں سے انگریزی فوجی حاکموں - گماشتوں - کارندوں اور حتیٰ کہ معمولی سپاہیوں نے جائز اور ناجائز طریقے سے کس قدر روپیہ اینٹھا ہوگا" (تاریخ ہند انگریزی)

سلطان کی شہادت پر ہندوستان اور انگلستان میں جو خوشیاں منائی گئیں اُن کا اندازہ صرف بیانات سے نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اُن کے اظہار کے واسطے الفاظ ناکافی ہیں - انگریز خوشیاں کیوں نہ مناتے - اُن کی تو من مانی مرادیں پوری ہو گئیں اور بہ قول لارڈ ہارس اب ہندوستان اُن کا ہو گیا - اور بہ قول لارڈ ولزلی اُس پر قبضہ کرنے کے واسطے سب دروازے کھل گئے - جو کانٹا اُن کے راستے میں حائل تھا وہ ہٹ گیا - لارڈ ولزلی نے اس فتح کے بعد بہ قول ولسن اپنے ایک دوست کو لکھا کہ وہ ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کرے گا کہ کمپنی کے ڈائرکٹران ہندوستان پر رحم کرنے کے واسطے درخواست کریں گے - اس تحریر سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں فتوحات کس بے رحمی کے ساتھ حاصل کی جاتی تھیں - ایک دوسرے خط میں لارڈ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ "ٹیپو سلطان کی موت اور اس کی سلطنت کا خاتمہ دیگر ہندوستانی حکمرانوں کے لیے

ایک ایسا سبق ہے کہ وہ آئندہ ہمارے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔"

لارڈ ولزلی کو اُن کے ایک دوست نے ان الفاظ میں مبارک باد دی :- "ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے نمایاں، سب سے شاندار - اور سب سے بڑا کارنامہ اس طرح آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔"

لارڈ صاحب کو ان خدمات کے صلہ میں 'مارکوئیس' کا خطاب اور عہدہ دیا گیا اور "جنرل ہارس کو جو ایک غریب پادری کا لڑکا تھا "لارڈ آف سرنگاپٹم" بنا دیا گیا۔

نقد انعامات، جو ان لارڈ صاحبان اور دیگر انگریزوں نے خود حاصل کیے تھے۔ اُن کی تفصیل اس سے پہلے دی جا چکی ہے۔

فوج کے سپاہیوں نے بھی بے شمار دولت مال غنیمت میں پائی تھی۔ ان کو تمغے بھی دیے گئے تھے۔ تمغے دینے کا رواج اب بھی ہے لیکن اس تمغہ کی جو سرنگاپٹم فتح کرنے والی فوجوں کے سپاہیوں کو دیے گئے تھے خاص بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ تھی کہ تمغہ کے ایک طرف تو سرنگاپٹم کے تسخیر ہونے کی تاریخ درج تھی اور دوسری طرف دریا کاویری میں ایک پچھڑے ہوئے شیر کی تصویر تھی جس کو سینٹ جارج ایک گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ مار رہا تھا۔ گویا انگریزوں نے کبھی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہمارا شہید سلطان ٹیپو شیر تھا۔ یہ

نہیں بلکہ شیر ہندوستان تھا۔

یہاں ایک اور واقعہ کی طرف جو سلطان کی زندگی میں پیش آیا تھا اشارہ کر دینا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ معتبر اور تاریخی روایت ہے کہ سلطانی محل کے ایک وسیع کمرے میں ایک خوشنما قالین پڑا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت خوشنما جھاڑی بنی ہوئی تھی، جس میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک زبردست شیر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں میں چھپا ہوا ایک شکاری بندوق ہاتھ میں لیے شیر کو تاک رہا تھا۔ شکاری کے سر پر فرنگی ٹوپی تھی مگر شیر اس سے بالکل بے پرواہ تھا ایک فقیر سلطان کی طلب پر اسی کمرہ میں آیا اور اس نے قالین کو بغور دیکھا۔ سلطان سے اس کی بہت سی باتیں ہوئیں جن کو سن کر سلطان سراپا حیرت بن گیا۔ ابھی اس کی حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فقیر اُٹھ کر چلنے لگا۔ سلطان بھی ساتھ ہی اُٹھا اور نہایت منت سے کہنے لگا "سائیں جی کچھ میری قسمت بھی بتا دیجیے" فقیر پلٹا اور کہنے لگا:۔

"شہنشاہ کی قسمت؟ وہ اس قالین پر نقش ہے"

کیسی پیشین گوئی تھی کہ حرف بہ حرف پوری ہوئی اور واقعات بتلاتے ہیں کہ سلطان کی قسمت کا نقش گویا ہندوستان کی قسمت کا نقش تھا۔

سلطان ٹیپو کی پیدائش سے لے کر اُس کی شہادت تک کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر دیے گئے ہیں۔ اب ہم سلطان کے ذاتی کیرکٹر۔ ہمہ گیر قابلیت۔ اُس کی مسلّمہ سیاست دانی اور عالم گیر رواداری کے متعلق جستہ جستہ باتیں اگلے ابواب میں بیان کریں گے۔



سلطان کا ذاتی کیرکٹر

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سلطان کا صحیح مرتبہ پہچاننے کے واسطے کافی نہیں ہے۔ اور ان حالات نے سلطان کے کیرکٹر کے سب پہلوؤں کو روشن نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم مختصراً اس کی تعلیم و تربیت۔ علمی قابلیت۔ عادات و خصائل۔ اور رہن سہن وغیرہ کے بارہ میں کچھ باتیں ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ بہ حیثیت انسان کے وہ کس درجہ پر پہونچتا ہے۔

سلطان کی تعلیم کے واسطے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ملک کے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا گیا تھا اور اُن ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ وہ رائج الوقت علوم و فنون پر عبور کامل رکھتا تھا۔ عام طور پر وہ فارسی زبان میں گفتگو کرتا تھا لیکن تحریر و تقریر میں مقامی زبانیں بھی کمال مہارت سے استعمال کرتا تھا۔ اوائل عمر میں تحصیل علم اور انشا پردازی کی طرف زیادہ رغبت تھی لیکن حیدر علی کے صرف ایک اشارہ نے اس کو اہل قلم سے اہل سیف بنا دیا تھا۔ لیکن طبیعت میں انشا پردازی کے جو جوہر تھے وہ ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے اور یہی وجہ تھی کہ بہ قول "کرنل کرک پیٹرک" اس کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل الگ تھلگ ہوتی تھی اور ایسی مختصر اور پُر معنی ہوتی تھی کہ ایک

ایک لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے تھے۔ اُس کی تحریر کا خاص وصف یہ تھا
کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے
الفاظ میں تحکم پایا جاتا تھا۔

مسٹر کیمبل لکھتا ہے کہ: "وہ سلطان نہایت آسانی سے نثر و نظم
لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک خاص شان پائی جاتی [illegible]

تصنیف و تالیف سے بھی اس کو شوق تھا اور باوجود انتہائی
عدیم الفرصتی کے وہ تصانیف کی نگرانی کے واسطے بھی وقت نکال
لیتا تھا۔ اُس نے علوم و فنون کی اشاعت کی طرف بھی توجہ [illegible]
سرنگاپٹم میں ایک یونیورسٹی قائم کی جس میں دینی علوم کے [illegible]
دیگر علوم و فنون بھی پڑھائے جاتے تھے۔ یونیورسٹی کا [illegible]
تھا اور سلطان بذات خود اس کا سرپرست تھا۔

سلطان کا ذاتی کتب خانہ نہایت شان دار تھا اور اس [illegible]
بعض نادر کتابیں تھیں۔ اس کتب خانہ کی جو فہرست میجر اسٹورٹ نے
تیار کی تھی وہ ۱۸۰۹ء میں کیمبرج میں چھپ کر شائع ہوئی۔ سلطان
کی شہادت اور سرنگاپٹم کی بربادی کے بعد اس کی کچھ کتابیں تو کلکتہ
کو منتقل کی گئیں مگر زیادہ تعداد ولایت بھیج دی گئی۔ [illegible]
سے کلام مجید کا ایک نسخہ انگریزوں کے ہاتھ لگا تھا جو اب ونڈسر محل
کی لائبریری میں موجود ہے۔

سلطان کے اس ذوق کے متعلق میجر اسٹورٹ [illegible]

"کتب خانہ کی ترتیب اور تہذیب کے لیے ایک مہتمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ سلطان کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق ہیں۔ سلطان نے اپنے فرامین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے جو اس وقت بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ سلطان جو کتاب مطالعہ کر چکتا تھا اس پر مُہر لگا دیتا تھا۔ اس طرح اکثر کتابوں پر مُہریں ثبت تھیں۔"

سلطان کے تبحر کا اندازہ اُس کے اُن احکامات سے ہو سکتا ہے کہ جو وہ خود عرضیوں پر لکھا تا تھا۔ کوئی فن اور کوئی محکمہ ایسا نہ تھا کہ جس کے متعلق وہ کافی معلومات نہ رکھتا ہو اور خود موزوں اور جامع حکم نہ دیتا ہو۔

باوجود اس قابلیت اور مرتبہ کے وہ شیریں کلام تھا اور فحش گوئی سے اس کو سخت نفرت تھی۔ نہ تو خود اپنی زبان سے کوئی فحش بات کہتا تھا اور نہ دوسروں کی زبان سے اُس کا سُننا پسند کرتا تھا۔ اس کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ پیش قبض اور تلوار ہر وقت کمر کی پیٹی میں لگے رہتے تھے۔ گھوڑے کی سواری نہایت پسند کرتا تھا۔

اس کی طبیعت میں غیرت و حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں نہ تو خود دوسروں کو ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتا تھا۔ اور نہ

اوروں سے ایسے سلام کی توقع رکھتا تھا۔ میسور کی تیسری لڑائی میں صلح نامہ کی جو شرائط اس کو ماننے پر مجبور ہونا پڑا وہ اس کے واسطے بے حد تکلیف دہ تھیں۔ اُس دن سے لے کر شہادت کے دن تک کبھی چارپائی پر نہیں سویا۔ فرش زمین پر کھدر کے موٹے کپڑے پر سوتا تھا۔ اور قسم کھالی تھی کہ جب تک اس کا انتقام نہ لے لوں گا چارپائی پر سونا حرام ہے۔ اور اُس نے کیا بھی یہی مرتے دم تک چارپائی پر نہ سویا۔

سحر خیزی اس کی عادت تھی۔ طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہوکر نماز سے فراغت حاصل کرتا اور پھر ایک گھنٹے قرآن پاک کی تلاوت میں صرف کرتا۔ اس کے بعد چہل قدمی اور جواہرات کے معائنہ سے فارغ ہوکر ناشتہ کرتا۔ ناشتہ کے وقت چھوٹے شہزادگان اور ایک منشی ساتھ ہوتے تھے۔ خطوط اور اُن کے جوابات اُسی وقت لکھتا تھا۔ ناشتہ میں دودھ اور پھل کا استعمال زیادہ رکھتا تھا۔ کھانا سادہ ہوتا تھا اور وہ بھی صرف دو وقت۔ اس کے بعد فوج کے معائنہ سے فراغت حاصل کرکے باہر سے آنے والی ڈاک کے جوابات لکھواتا تھا۔ دیگر احکامات بھی اُسی وقت دیے جاتے تھے۔ رات کے کھانے پر بڑے شہزادگان اور افسران سلطنت کا حاضر رہنا ضروری تھا۔ کھانا ادبی اور تاریخی مباحثوں میں ختم کیا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کرتا اور پھر سونے کے وقت تک کوئی

نہ کوئی کتاب مطالعہ میں رہتی اور ایسی کو پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔
الغرض دن۔ رات کا ایک منٹ بھی بیکار نہ کھوتا تھا۔ اس کے
سب کاموں میں پروگرام کی باقاعدگی اور سلیقہ پایا جاتا تھا۔
میسور گزیٹ کا مصنف لکھتا ہے کہ "ٹیپو میں ایک سب سے بڑا
وصف یہ تھا کہ وہ دن بھر بغیر آرام کیے امورِ سلطنت کے کاموں
میں مصروف رہتا تھا۔ اور ہر کام قرینہ اور قاعدہ سے ہوتا تھا۔
وہ روزانہ اس قدر خط و کتابت اپنے ہاتھ سے کرتا تھا کہ دیکھ کر
اس کی جفاکشی اور اس کے دل و دماغ پر حیرت ہوتی ہے"

سلطان مذہب اور روزہ نماز کا ایسا پابند تھا کہ بڑے بڑے
علما بھی اس خوبی میں اس کے ہم پلہ نہیں تھے۔ وہ دوسرے
مذہب کے دین دار لوگوں کا بھی بے حد احترام کرتا تھا۔ روایت
ہے کہ مسجد اعلیٰ کے افتتاح کی رسم کے وقت یہ اعلان ہوا کہ سب
سے پہلی نماز وہ شخص پڑھائے جس کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو
مجمع میں سیکڑوں علما اور فضلا تھے۔ سب کے سب ایک دوسرے
کا منہ تکنے لگے اور کسی کو امامت کرنے کی جرأت اور ہمت نہ ہوئی
یہ حالت دیکھ کر سلطان آگے بڑھا اور فرمایا کہ الحمدللہ میں صاحبِ
ترتیب ہوں۔ [illegible] سلطان ہی نے [illegible] ادا [illegible] نماز شروع
[illegible]

اس کو لہو و لعب اور عیاشی سے سخت نفرت تھی۔ اس نے

اپنی رعیت کو شراب خواری اور عیش پرستی سے روکنے کے واسطے
سخت احکامات جاری کیے تھے۔ اپنی تمام مملکت میں ہندوستانی
باشندگان کے لیے شراب نوشی ممنوع قرار دے دی تھی اور جرم کے
مجرم کو سخت سے سخت سزا دیے جانے کے احکامات تھے۔

سلطان کی حیا اور شرم کا یہ حال تھا کہ اس کے چہرے، ٹخنوں
اور ہاتھ کی کلائیوں کے سوائے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ کسی نے
برہنہ نہیں دیکھا تھا۔ مورخین کا قول ہے کہ حمام میں بھی وہ برہنہ
نہیں ہوتا تھا اور اپنے جسم کو چھپائے رکھتا تھا۔ اسلام نے ستر پوشی
کے واسطے جو احکامات دیے ہیں ان کی پابندی سلطان ٹیپو نے
پوری پوری طرح کی اور دنیائے اسلام میں اس کی مثال شاید
مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

دکن میں عام رواج تھا کہ عورتیں ننگے سر اور برہنہ سینہ باہر
نکلتی تھیں چونکہ یہ طریقہ تہذیب و شائستگی کے درجہ سے گرا ہوا
تھا لہذا سلطان نے اس کے خلاف احکامات جاری کیے۔
لڑکیوں کی خرید و فروخت پر بھی پابندیاں قائم کر کے اس کو
ممنوع قرار دیا۔ اس طرح اس نے ملک اور سوسائٹی میں صنف
نازک کا احترام بڑھایا۔ ان خراب رسموں کے روکنے کی اس وقت
ملک میں سخت ضرورت تھی۔ وہ خود بھی اس صنف کا بے حد احترام
کرتا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم اوپر لڑائیوں کے حالات میں بیان

کر آئے ہیں۔ اس نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو مستورات کی طرف سے لاپرواہی برتنے پر عبرت ناک سزائیں دی تھیں۔ اور جب دشمنوں کے حرم مال غنیمت میں اُس کے ہاتھ آئے تو اُن کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور اُن کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے فوجی دستوں کی نگرانی میں اُن کے کیمپ میں پہونچا پہونچا دیا۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ ان کے ہمراہ تحفہ تحائف بھی بھیجے۔

والدین کے احکامات کے سامنے اُس نے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا۔ حالانکہ اکثر اوقات اس کی ماں کے حکم اس کی خواہشوں کے خلاف ہوتے تھے مگر وہ ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کی تعمیل کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

ایک مورخ نے اس کی اس صفت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "اس کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ماں کی نصیحت سے کبھی اس نے بے اعتنائی نہیں کی۔ گو بعض اوقات، ماں کی باتیں اس کی خواہشوں کے بالکل خلاف ہوتی تھیں"

اس کے زمانہ میں ہندوستان کے بعض حصوں میں انسانی قربانی کا بھی رواج تھا مملکت میسور میں جہاں جہاں یہ قبیح رسم پائی جاتی تھی اُس کو سلطان نے رُوکا اور اس کے انسداد کے واسطے ایسے سخت احکامات اور قوانین جاری کیے کہ بالآخر وہ مسدود ہو گئی۔ اُس نے اپنی مملکت میں غریب۔ نادار اور بے کس بچوں کی پرورش

اور غور و پرداخت کے واسطے جا بجا یتیم خانے جاری کیے۔ غلامی اور بردہ فروشی کی خراب انسانیت سوز رسموں کو بھی جو اس وقت تمام ملک میں جاری تھیں اُس نے سختی سے رُوکا۔ سلطان کے یہ کام ایسے ہیں کہ اس کے نام کو دنیا کی تاریخ میں باعزت جگہ ملنا چاہیے۔

سلطان عادتاً رحم دل تھا۔ نہ خود ظلم کرتا تھا نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتا تھا۔ اس کی رحم دلی ہر خاص و عام کے ساتھ یکساں تھی۔ اس میں چھوٹے۔ بڑے۔ ہندو۔ مسلمان۔ ملازم۔ آقا۔ آزاد و قیدی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اپنے نجی ملازموں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتا تھا۔ سرکاری قیدیوں کے آرام کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک مورخ نے اس کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ: "ایک مرتبہ رات کا وقت تھا۔ سلطان اپنے خیمہ میں سو رہا تھا تو اس کو کراہنے کی آواز آئی۔ خیمہ سے نکل کر دیکھا تو قیدی پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ سلطان نے خود جا کر اُنھیں پانی پلایا اور اُس وقت تک نہیں سویا کہ جب تک یہ قیدی نہیں سو گئے"۔

اللہ اللہ جو شخص بادشاہ ہو کر اپنے قیدیوں کے آرام کا اس قدر خیال رکھتا ہو اُس کو اُس کے ہی سردار و وزیر غداری کر کے چھ سات گھنٹے دست بہ دست لڑائی کرتے وقت بھی

اگر یہ تشنہ پانی کو ترسائیں۔ حضرت امام حسینؓ شہید کربلا کا واقعہ [illegible] پیش [illegible] سکتا ہے ورنہ دنیا میں تو اس کی دوسری مثال [illegible] پائی جا سکتی ہے۔

سلطان [illegible] کو ملکی مصنوعات کی ترقی کا بے حد خیال تھا اور اس خیال کو اس نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ پبلک کے سامنے اُس نے وہ نمونہ پیش کیا جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہیں۔ چنانچہ اُس نے نہ تو کبھی بدیسی کپڑا استعمال کیا اور نہ اپنے افسران کو اس کی اجازت دی۔ یہ ہی حال نمک کا تھا۔ صرف اپنے ہی ملک کا بنا ہوا نمک کھانے میں استعمال کرتا تھا۔

سلطان اوائل عمر ہی سے بہادر تھا اور بہادروں کا بھی خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہوں احترام کرتا تھا۔ شیر کا شکار اس کی بہترین تفریح تھی مگر شیر کا شکار تلوار سے کرنا اس کو زیادہ مرغوب تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شیر کے شکار میں اس کے ایک ساتھی نے شیر پر بندوق کا نشانہ کیا۔ سلطان قریب ہی تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس کی بندوق چھین لی اور جوں ہی شیر نے حملہ کیا تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اُس کی چاروں ٹانگیں قلم ہو کر گر گئیں اور وہ بے بس ہو گیا۔ اُس نے اپنے محل میں بھی شیر پال رکھے تھے اور جب اُس کو شکار کا وقت نہیں ملتا تھا تو اُن ہی سے دل بہلاتا تھا۔

درحقیقت شیر سے اسے قلبی لگاؤ تھا یہاں تک کہ شیر کا رنگ بھی اس کا مرغوب ترین رنگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شیر میسور کہلانے کا مستحق ہے۔

انسانی خوب صورتی کے متعلق اس کا نظریہ عام خیالات سے قدرے مختلف تھا چنانچہ اس کا اظہار اس نے اس موقع پر کیا کہ جب اس کی شادی کے وقت اس کی تصویر کھنچوانے کا سوال پیدا ہوا۔ اس وقت اُس نے فرمایا:۔ "مردوں کی بہترین تصویر اُن کی جواں مردی ہے"

وہ خود جواں مرد اور بہادر تھا اور موت کے ساتھ کھیلنا اس کا خاصہ تھا اس کی بہادری کی داستان! اُن معرکوں سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو اس کو اپنی زندگی میں پیش آئے۔ ہم نے اس کی تھوڑی سی تفصیل سرنگاپٹم کے آخری محاصرہ کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے موت کا مقابلہ بہادروں کی طرح سے کیا جس کا اعتراف اس کے دشمنوں کو بھی ہے۔ میسور گزٹ کا مصنف اس کی جواں مردی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

اس کی سپاہیانہ بے جگری۔ اس کی ذاتی بہادری اور ایسے وقت میں بھی جب شکست یقینی تھی اس کا اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ نہ کرنا شجاعت اور جواں مردی کی وہ بے نظیر مثال ہے

جس کے واسطے وہ صد درجہ تعریف کا مستحق ہے۔ ان لوگوں سے
جنھیں وہ اپنا دوست جانتا تھا کبھی اُس نے بے وفائی نہیں کی
۱۷۹۹ء کی جنگ میں انگریزوں کا مطالبہ تھا کہ اُس کی ملازمت
میں جو چند فرانسیسی ہیں اُنھیں حوالہ کر دیا جائے۔ فرانسیسیوں کو
انگریزوں کے حوالہ کر دینے سے وہ اپنے تاج و تخت کو بچا سکتا تھا
لیکن اس کی شجاعت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔"

یہی مصنف ٹیپو سلطان اور نپولین اعظم کا مقابلہ کرتے ہوئے
لکھتا ہے:-

"ٹیپو نے اپنے لیے وہ موت پسند کی جس سے اس کا ہم عصر
دوست نپولین ہمیشہ ترساں رہا۔" ان بیانات سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا
ہے کہ وہ اپنے ہوا خواہوں کا کس حد تک خیال کرتا تھا۔

ناظرین نپولین اعظم سے جس کو دنیا نے بہترین جنرل اور
دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار مانا ہے ٹیپو سلطان کا مقابلہ کرکے خود
فیصلہ کریں کہ ان دونوں کی بہادری میں کیا فرق ہے۔ ٹیپو سلطان کے
آخری وقت کی بہادری کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔ اب ذرا
نپولین اعظم کا آخری کارنامہ دیکھ لیجیے۔ ٹیپو کی طرح نپولین کی
شکست بھی اس کے اُمرا کی غداری ہی کا نتیجہ تھی لیکن نپولین نے
شکست کھا جانے پر اپنا ملک دشمنوں کے حوالہ کر کے اپنی ذات کو
بھی ان ہی کے قدموں پر ڈال دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی زندگی کے

آخری لمحات بھی قید فرنگ میں کاٹتا ہوا دنیا سے چل بسا مگر ہمارا ہیرو ٹیپو سلطان یہ کہتا ہوا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی آزادانہ زندگی بہتر ہے بھوکا۔ پیاسا دشمنوں کی بے پناہ آگ اور توپوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنی آزادی برقرار رکھتے ہوئے اپنے ملک اور وطن کی آزادی پر قربان ہو گیا۔

لیکن یہ فرق بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ نپولین کی زندہ اور باعزت قوم نے اپنے ہیرو کو شہرت کے آسمان پر پہونچا دیا اور پھر دنیا کو بھی اس کی شہرت و عظمت کا خراج تحسین ادا کرنا پڑا۔ مگر برخلاف اس کے ٹیپو کو نہ تو اس کے ملک والوں ہی نے پہچانا اور نہ غیروں نے اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اور جو لوگ اس کے مرتبہ اور عظمت کو جانتے تھے انھوں نے اس کی شہرت و عظمت کو مٹانے اور اس کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ نپولین کے حالات دنیا کی سب زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ہر پڑھا لکھا آدمی اس کے نام سے واقف ہے مگر ٹیپو سلطان کے حالات اس کے ملک کے بچوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہیں اور اس طرح دونوں کی شہرت میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔

انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو بدنام کرنے میں جو کوشش کی تھی اس کے متعلق ہم ایک عیسائی مصنف ہی کے خیالات و الفاظ

ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کیپٹن نطل لکھتا ہے کہ: "گذشتہ چند سالوں سے انگریزی زبان کے اُن تمام الفاظ کو ڈھونڈھ کر نکالا جا رہا ہے جن سے ٹیپو کو بدنام کیا جا سکے۔ لغات میں ذلیل سے ذلیل الفاظ سلطان کی اہانت کی غرض سے تلاش کر کے نکالے جا رہے ہیں۔ باوجود اس کے بہت سے لوگوں کو رنج ہے کہ زبان میں اس قدر وسعت نہیں کہ ٹیپو سلطان کو جی بھر کر گالیاں دی جائیں۔ اس لیے وہ نئی اصطلاحات وضع کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں"۔

یہ ہی نہیں کیا گیا بلکہ ٹیپو کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے اپنے کتوں کو ٹیپو کا نام دینا شروع کیا اور ہمارے ہندوستانی بھائیوں نے بھی اُن کی اندھی تقلید کی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو کے نام سے انگلستان والے کانپتے تھے اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ انگریزی بچوں کی دایہ اور مستورات جب اپنے بچوں کو ڈرانا اور خوف زدہ کرنا چاہتی تھیں تو ٹیپو ہی کے نام کی مدد لی جاتی تھی۔ غرضیکہ اس شہید وطن کے وقار کو خاک میں ملانے کے واسطے ہر ممکن کوشش کی گئی جیسا کہ ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے کہ: "سلطان کے وقار کو خاک میں ملانے کی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی گئی"۔

سلطان کی جنگی قابلیت اس کے کارناموں سے عیاں ہے۔ اُس نے صدہا موقعوں پر اس قابلیت کا اظہار کیا اور اسی کی بدولت

انگریزوں کے بڑے بڑے کارآزمودہ جنرلوں کو نیچا دکھایا اور
شکستیں دیں اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے دل اس کی طرف سے
عداوت و نفرت سے بھر گئے تھے۔

وہ دلیروں اور جاں بازوں کی طرح صرف تلوار ہی کا دھنی
نہیں تھا بلکہ میدان جنگ کے نقشوں اور چالوں کو بھی خوب
سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کو
اپنی فوج کی تربیت اور آراستگی کے واسطے کیسے قواعد اور
ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ جتنا وہ بری فوج کے نظام کے
متعلق جانتا تھا اتنا ہی وہ بحری بیڑہ کی ضروریات سے بھی
واقف تھا چنانچہ اس کی لیاقت اور قابلیت کے متعلق "بورنگ"
کی رائے ہے کہ وہ :-

"وزارت کا کام کر سکتا تھا۔ سپہ سالاری میں طاق تھا۔
امیر البحر تھا۔ اور سب قسم کے علوم و فنون میں کامل مہارت رکھتا
تھا۔ اس کی قابلیت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ جس وقت جنگی
بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے امیران یم کی جماعت میں
جہازوں کے نمونے تک کھینچ دیے تھے کہ ان نمونوں کے مطابق
جہاز تیار کیے جائیں اور جہازوں کے پیندوں کے واسطے ہدایت
ہوئی تھی کہ تانبے کے بنائے جائیں۔ نیز جہازوں کی لکڑی کے لیے
جنگل بھی قائم کر دیا گیا تھا۔"

کرنل آرتھر ولزلی نے جو خود سلطان کے خلاف فوج کشی میں شریک تھا اس کی کیولری کی تربیت کے متعلق اپنے تاثرات کو اس طرح ظاہر کیا ہے :-

"اس کی کیولری دنیا میں سب سے بہترین فوج ہے۔ ہمارے اس ملک میں داخل ہونے کے وقت سے وہ ہمارے پیچھے اس طرح لگی رہی کہ ہماری فوج میں سے ایک آدمی کا بھی کیمپ سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔"

یہی کرنل سلطان کی فن انجینیری کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :- "جب ہم محل میں سلطان کے خاص کمرے میں داخل ہوئے تو یہاں چارپائی کے قریب میز پر اقلیدس کا ایک نسخہ۔ چند کاغذات جن پر اقلیدس کے نقشے بنے ہوئے تھے۔ اور پرکار وغیرہ کا ایک بکس رکھا ہوا تھا۔"

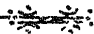
اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملٹری انجینیر بھی تھا، وہ نقشے تیار کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ مگر اس قابلیت۔ شجاعت، اور جواں مردی کے ہوتے ہوئے بھی بہ قول حضرت میر ؎

شکست و فتح تو قسمت پہ ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اسی خیال کو ماڈرن میسور کے مصنف نے نثر میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :- "سلطان کی جنگی فراست و قابلیت میں

کوئی شک نہیں۔ لیکن جنگ کا نتیجہ جو نکلا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے پہلے ہی سے اُس کا تہیہ کر رکھا تھا اور قدرت پر کامیاب ہونا انسان کی دسترس سے باہر ہے "

سلطان کی ذاتی جنگی قابلیت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا اب اُس کی فوجی تنظیم و تربیت اُس کی اقتصادی بلند نظری اُس کی دانائی اور فراست اور وہ اصلاحات جو اُس نے اپنی مملکت میں جاری کی تھیں ہم کچھ باتیں اگلے باب میں بتائیں گے تاکہ اُن کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے کہ سلطان بہ حیثیت ایک بادشاہ کے کیسا تھا۔



اصلاحاتِ سُلطانی

سلطانی اصلاحات کا تذکرہ ہم میسور گزیٹیر کے مصنف کے خیالات اور الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :-
"اصلاحات کے لیے اس کے دل میں ایک حقیقی تڑپ موجود تھی اور یہی اس کی حکومت کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ گو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصلاحات قبل از وقت تھے یا بہ الفاظ دیگر ٹیپو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا"۔

مگر سلطان کے وقت سے پہلے پیدا ہونے یا اصلاحات کے قبل از وقت جاری کرنے کا فیصلہ تو اس کی جاری کردہ اصلاحات کی کامیابی۔ ناکامیابی اور ان کے ہر دل عزیز یا غیر ہر دل عزیز ہونے سے ہو سکتا ہے۔ واقعات صاف صاف بتاتے ہیں کہ سلطان واقعی اپنی دماغی قابلیت اور جدت طرازی اور بلند حوصلگی میں اپنے تمام ہم عصر بادشاہوں سے بلند اور آگے تھا مگر جو اصلاحات اس نے جاری کی تھیں ان کی واقعی ملک میں اشد ضرورت تھی اور اگر ہمارے ملک کی ترقی کو بدیسی حکومت اپنی اغراض پوری کرنے کے واسطے روک نہ دیتی اور ہمارے ملک کے بچوں کی ذہنی ترقی کو تباہ اور برباد کر کے ان کو غلامی کے واسطے تیار نہ کرتی تو صحیح رہنمائی کے ساتھ سلطانی اصلاحات

مملکت میسور سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل جاتیں اور ہمارا
ملک اب سے ایک صدی پہلے ہی دنیا کے متمدن۔ تہذیب اور
ترقی یافتہ ممالک کے دوش بہ دوش چلتا ہوا نظر آتا۔ جیسا کہ
مملکت میسور کی ترقی سے عیاں ہے۔ مگر سلطان کی شہادت
کے بعد انگریزوں کا اقتدار اور اثر پورے ہندوستان پر چھا گیا
اور اُنھوں نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور اپنے قبضہ کی گرفت
کو مضبوط کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی ترقی کے سب راستوں
کو مسدود کر دیا اور ہندوستان کی صنعت و حرفت کو رفتہ رفتہ ایسا
نیست و نابود کیا کہ اب ہمارا طالب علم یہ سوچ ہی نہیں سکتا ہے
کہ ہندوستان بھی کبھی صنعت و حرفت میں یورپ سے بڑھا ہوا
تھا۔ حالانکہ واقعہ یہی تھا۔

ہندوستانی صنعتوں کی بربادی اور تباہی کی داستان طویل
ہے اور اس کو تفصیل اور وضاحت سے بیان کرنے کی اس جگہ
گنجائش نہیں ہے لیکن ناظرین سلطانی اصلاحات کے حالات
پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج ہندوستانیوں میں جو بیداری
پیدا ہو گئی ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنے ملک میں ترقی اور اصلاحات
کے جس دور کا خواب دیکھ رہے ہیں اُس کی ابتدا سلطان نے اپنے
ملک میں کر کے ہمارے ملک والوں کی صحیح رہنمائی کر دی تھی مگر
اس کی قبل از وقت موت نے ہمارے پورے ملک کو ان سے مستفید ہونے کا

موقع نہیں دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ملکی ترقی کے صرف چند شعبہ جات کو چھوڑ کر انگریزوں کے دو سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوستان نے ترقی معکوس ہی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکومتِ ہند کا کوئی شعبہ ویسا مکمل اور ملک کے واسطے مفید نہیں ہے جیسے کہ حکومت میسور کے شعبہ جات تھے۔ ہندوستان میں ہم کو جو چند شعبہ جات ترقی یافتہ اور سلطانی مملکت کے شعبوں کے مقابلہ میں بہتر نظر آ رہے ہیں وہ اس لیے بہتر اور عمدہ نہیں ہیں کہ اس سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ترقی اور فلاح و بہبود مقصود تھی بلکہ اس کی اصل غایت و غرض ملک پر انگریزی قبضہ کی گرفت کو مضبوط تر کرنا تھی۔

آئیے اب ذرا ہم سلطانی مملکت کے اُن شعبہ جات کی حالت کا جائزہ لیں کہ جن کی ترقی پر ملک کی فلاح اور ملک والوں کی فارغ البالی کا انحصار ہے تاکہ ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی سلطنت میں رعایا کن حالوں میں تھی اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے اور حصّوں میں اُس کا کیا حال تھا۔

ہندوستان کو زراعتی ملک کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا زیادہ حصّہ دیہات میں آباد ہے اور زراعت ہی اُس کا ذریعہ معاش اور آمدنی ہے۔ لیکن کاشتکاروں کو زندہ رہنے کے واسطے صرف کمانے ہی کی تو ضرورت نہیں

ہوتی ہے اُن کی ضروریات کی اور بیسوں چیزیں ہیں اگر یہ چیزیں ملک میں پیدا نہ کی جائیں تو ان کی آمدنی کا زیادہ حصہ ان ضروریات کی چیزوں کی خریداری میں خرچ ہو کر اُن ملکوں کو چلا جائے گا کہ جو ان چیزوں کو بناتے اور ہندوستان بھیجتے ہیں۔ اس طرح ملک کی مرفہ الحالی اور فارغ البالی کا انحصار زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی مصنوعات کی ترقی پر بھی ہے مگر ہمارے بدنصیب ملک میں نہ تو زراعت ہی ترقی پر ہے اور نہ مصنوعات کی ترقی پر کچھ توجہ دی گئی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارا ملک دنیا کا غریب ترین ملک ہے اور اس کا کاشت کار دنیا بھر میں سب سے زیادہ مفلوک الحال اور تنگ دست ہے نہ تو اس کو پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے۔ زندگی کو آرام دہ بنانے کے واسطے جن چیزوں کی ضرورت ہے اُن کا خیال تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا ذکر ہم اس باب کے ابتدائی پیراگراف میں کر آئے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی زراعت زیادہ تر اُن اصولوں پر ہو رہی ہے جو اس ترقی کے دور میں کہنہ۔ فرسودہ اور بے کار محض ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ کسانوں اور کاشت کاروں کی آمدنی اور پیداوار دونوں ناکافی ہیں اور بجائے بڑھنے کے دن بہ دن کم ہو رہی

ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی گردن اور سارا جسم زمینداروں اور
ساہوکاروں کے آہنی پنجہ میں جکڑا ہوا ہے اور یہ لوگ جونکوں
کی طرح کاشتکاروں کا خون چوس رہے ہیں۔ کسانوں کی
بھلائی اور بہتری کے واسطے انگریزی راج نے اوّل تو کچھ
کیا ہی نہیں اور جو کچھ کیا بھی تو وہ صرف نمائشی اور ناکافی تھا
اور اب ان ہی خرابیوں کو دور کرنے اور ہندوستانیوں کی حالت
بہتر کرنے کا بیڑا ہماری قومی جماعت کانگریس نے اٹھایا ہے۔
اس جماعت اور اس کی حکومت کے ممبران نے ان ہی مقاصد
کو پورا کرنے کے واسطے آزادی کی جنگ لڑی اور تقریباً نصف
صدی سے زائد جیل خانوں کو آباد کیا اور ان کے مصائب جھیلے
اپنی جائدادوں سے ہاتھ دھویا اور پھانسی تک کے، اپنے خون اور
جانوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ اور اب ان کی بہتری کے
راستے کھلے اور ان کی دیرینہ خوابوں کی تعبیر پوری ہونے کا
وقت آیا ہے۔ لیکن ہماری داستان کے اس بدنام روزگار ہیرو
نے تو اس سے ڈیڑھ صدی پہلے ہی ان خرابیوں کا سدباب
کرتے ہوئے اپنے ملک میں تمام زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و
تعدی سے بچانے کے واسطے جاگیرداروں کو ختم کر دیا تھا اور
زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دیتے ہوئے زمیندار اور کاشتکار کے
کے اس درمیانی تعلق کو ختم کر دیا تھا کہ کاشتکار براہ راست

حکومت سے وابستہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے ٹیپو سلطان کاشت کار کو زمین کا مالک سمجھتا تھا۔

کاشت کاروں کی مزید حوصلہ افزائی اور امداد کے لیے پرتی زمینیں ان کو زراعت کے لیے مفت دی جاتی تھیں اور جب تک ایسی زمینوں سے آمدنی نہ ہونے لگتی تھی ان پر لگان مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ لگان کی تقرری کے اصول بھی مختلف تھے۔ زمین کا رقبہ لگان کی تقرری کا معیار نہیں مانا گیا تھا بلکہ اس کا تقرر پیداوار کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ اگر پیداوار کم ہوتی تو لگان کم کر دیا جاتا اور جب اچھی ہوتی تو ایک معینہ حد تک لگان زیادہ کر دیا جاتا تھا۔ لگان کی تحصیل وصول بھی کاشت کاروں کی منشا کے مطابق جنس یا نقد کی صورت میں ہوتی تھی۔ غلے کے مقامی نرخ سے جنسی لگان کو نقدی کی صورت میں متعین کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کا فیصلہ کہ کاشت کار نقد دے یا جنس کاشت کار ہی کی مرضی اور خوشی پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مملکت میسور کا کسان ہر طرح سے خوش باش۔ خوش حال اور فارغ البال تھا اور مملکت میسور سرسبز و شاداب تھی۔ نئے نئے شہر آباد ہو رہے تھے اور ہندوستان کا کوئی حصہ بھی خواہ وہ دیسی فرماں روا کے ماتحت ہو یا کمپنی کا مقبوضہ کسی حالت میں بھی میسور کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

سلطان نے زراعت کی ترقّی کے واسطے بنگلور اور سرنگاپٹم میں دو فارم بھی کھلوائے تھے اور یہ دونوں لال باغ کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں دوسرے ممالک سے منگوا کر پیڑ اور پودے لگائے جاتے تھے اور اُن پر تجربات کیے جاتے تھے۔ جن پودوں کے لیے میسور کی آب و ہوا و زمین موافق ثابت ہوتی تھی اُن کی کاشت کو ملک بھر میں رائج کیا جاتا تھا اور ان کی کاشت اور پیداوار کو بڑھانے اور ترقی دینے کے واسطے حکومت کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اسی طرح مصنوعات کی ترقی کے واسطے جن فصلوں کی ضرورت ہوتی تھی وہ بھی باہر سے منگوا کر پیدا کرائی جاتی تھیں چنانچہ ریشم کی پیداوار کے واسطے سلطان نے بنگالہ اور چین کو وفود بھیجے اور وہاں سے شہتوت کے درخت اور ریشم کے کیڑے منگوا کر اپنے ملک میں ان کی پرورش اور پیداوار کا انتظام کیا۔ اس طرح ریشم کی خریداری پر جو روپیہ ملک سے باہر چلا جاتا تھا اس کو ملک ہی کے اندر روکنے کی کوشش کی۔

سلطانی فارم کے متعلق ایک مشہور سیاح "بچانن" اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "میں نے لال باغ دیکھا۔ یہاں زمین کو مربع قطعوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور قطعوں کے بازو راستے ہیں جس پر دونوں جانب خوبصورت سرو کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ یہ

قطعے پھل دار درختوں اور گملوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ درختوں کی قسموں کے علیحدہ علیحدہ قطعے مخصوص کیے گئے ہیں۔ یہاں سردہ۔ انگور۔ ناسپاتی اور سیب کثرت سے اور نہایت عمدہ ہوتے ہیں یہ تعجب سے دیکھا گیا کہ ٹیپو نے جنوبی افریقہ سے صنوبر اور سرو اور [illegible] منگا کر لگائے ہیں وہ نہایت اچھی حالت میں ہیں۔"

ایک اور سیاح اسی کے بارہ میں یوں لکھتا ہے کہ:۔ "لال باغ میں ٹیپو نے تجربہ کے طور پر دنیا کے تمام درخت لگا رکھے ہیں اور یہاں رات دن تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ کون سے مفید درخت یہاں کی آب و ہوا کے لحاظ سے موزوں ہو سکتے ہیں۔"

چنانچہ میسور میں جاڑے پھل۔ کافی۔ انجیر۔ شہتوت۔ امرود۔ تربوز وغیرہ کی کاشت ان ہی تجربات کی رہین منت ہے اور ان میں سے بعض بعض چیزیں تو اب بھی میسور سے ممالک غیر کو بھیجی جاتی ہیں۔

کسانوں کی فلاح اور بہبود اور زراعت کی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے سلطان نے آب پاشی کے ذرائع بہم پہونچانے کی بھی کوشش کی اور دریائے کاویری کا پشتہ بنوانا شروع کیا۔ مگر سلطان کی قبل از وقت موت کی وجہ سے اس کا یہ عظیم الشان کام یوں ہی ادھورا رہ گیا۔ اس کی اس کوشش کی عظمت کا پتہ

اس بات سے چلتا ہے کہ جب حکومت میسور نے اسی دریائے کاویری پر بند باندھنا چاہا تو مقامی انجینیروں کی رہنمائی کے واسطے بین الاقوامی شہرت اور تجربہ کے انجینیر بیرونی ممالک سے بلائے تو انھوں نے برسوں کی کوشش اور جد و جہد کے بعد ایک جگہ کو بند کے واسطے منتخب کیا۔ کھدائی کا کام شروع ہونے پر اسی جگہ ایک اور پشتہ کی بنیادیں اور ایک کتبہ برآمد ہوئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ٹیپو نے اب سے صدیوں قبل اسی جگہ کو بند کے واسطے تجویز کر کے اس کا سنگ بنیاد رکھ دیا تھا۔ کتبہ اب بھی میسور میں موجود ہے۔ اس کتبہ میں آب پاشی کے محصول کے بارہ میں جو احکامات موجود ہیں اُن کی نقل ناظرین کے ملاحظہ کے لیے درج کی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ آب پاشی کرنے والوں کے ساتھ کیسی رعایتیں کی گئی تھیں۔ اس کتبہ میں لکھا ہوا ہے کہ :۔

"قدیم یا جدید کاشت کے علاوہ بھی جو کوئی بھی اس تالاب سے آب پاشی کرے گا وہ اس پیداوار یا رقم کا جو اور رعایا قانوناً سرکار میں جمع کرتی ہے صرف تین چوتھائی حصہ سرکار خداداد کو دے۔ باقی ماندہ ایک چوتھائی خدا کی راہ میں معاف ہے۔ اور جو کوئی اس پشتہ سے نئی زمین میں کھیتی باڑی کرے گا تو وہ زمین اس کی اولاد اور وارثوں کے قبضہ میں نسلاً بعد نسلٍ پشت در پشت تک

رہے گی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ اگر کوئی شخص اس میں رکاوٹ ڈالے یا اس کارِ خیر میں مداخلت کرے تو وہ کمینہ خصلت ملعون شیطان کی طرح صرف کسانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام انسانی نسل کا دشمن سمجھا جائے گا۔"

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آب پاشی کرنے والوں کے واسطے سلطان نے کس قدر مراعات روا رکھی تھیں اور اس کام میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو وہ کس طرح کسانوں اور نسل انسانی کا دشمن سمجھتا تھا۔

اس نے اس حکم کے ذریعہ سے صرف آب پاشی کا محصول ہی معاف نہیں کیا بلکہ اصل لگان میں سے بھی ایک چوتھائی لگان معاف کر دیا تھا۔ ہندوستان میں کھیتی باڑی کا کام مشینوں سے تو ہوتا نہیں ہے ملک بھر کے کسان اور کاشت کار اس کام کو مویشیوں کے ذریعہ ہی سے کرتے ہیں اور اچھے مویشیوں کی کمی، ان کی دیگر مشکلات کے ساتھ ساتھ ان کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ کاشت کے قابل اچھے جانوروں کی قیمتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ معمولی کاشت کار تو اُن کو خریدنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا ہے۔ یہی حال دودھ دینے والے جانوروں کا ہے۔ اُن کی نسلیں خراب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ چارہ کی کمی اور اُن کی غور و پرداخت میں بے توجہی کی وجہ سے ان جانوروں کے بچے

چھوٹے اور کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کے دودھ کی پیداوار برابر گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے بچوں کو دودھ و گھی اس مقدار میں نہیں مل سکتا ہے کہ جس کی ان کو اچھی نشوونما کے لیے سخت ضرورت ہے۔ اس خرابی نے ملک کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ ایک طرف تو کاشت کاری کے کاموں کے واسطے اچھے جانور نہیں ملتے جس کی وجہ سے زراعت خراب ہو رہی ہے۔ دوسری طرف دودھ اور گھی کی کمی کی وجہ سے ہمارے ملک کے بچے اور آدمی نسلاً بعد نسلٍ کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

سلطان کی نگاہ دوربین نے اس نقص کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا چنانچہ اس نے اپنے ملک میں مویشیوں کی نسل بہتر کرنے کے واسطے ایک محکمہ امرت محل کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس محکمہ میں بیل۔ گائے گھوڑے۔ خچر اور ہاتھیوں کی پرورش اور اُن کی عمدہ نسل کشی کا انتظام ہوتا تھا۔ ان مویشیوں کو چرانے اور پالنے کے واسطے حکومت کی طرف سے چراگاہیں چھوڑی گئی تھیں اور ان کا رکھ رکھاؤ نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔

اس ادارہ کے جانوروں کی عمدگی اور برتری کو یورپین مورخین نے بھی طرح طرح سے سراہا ہے۔

الغرض زراعت کو اعلیٰ پیمانے پر لانے کے واسطے سلطان نے

وہ سب کچھ کیا کہ جو آج متمدن ممالک میں ہو رہا ہے یا جس کی آرزوئیں اور تمنائیں آج ہمارے دلوں میں ہیں۔

سلطان نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی پر بھی توجہ دی۔ بہ قول "بچانن" وہ ایک تجارتی دماغ لے کر پیدا ہوا تھا اور سلطان کے اسی رجحانِ طبع کو دیکھ کر میجر "ایلن" یہ لکھنے پر مجبور رہا کہ ٹیپو علاوہ بادشاہ ہونے کے ایک بڑا تاجر بھی تھا۔ اُس نے تجارتی اصول و ضوابط پر ایک کتاب بھی تصنیف کی "رئیس" کا قول ہے کہ اُس نے اپنے ملک میں ایسے احکامات جاری کیے تھے جن کی رو سے وہ صدر التجار تھا۔ تجارت کی ترقی اور نگرانی کے واسطے اس نے محکمہ تجارت قائم کیا تھا۔ اس محکمہ میں نو ٹریڈ کمشنر تھے اور ان کی نگرانی میں ممالک غیر سے تجارت کرنے کے واسطے سترہ کوٹھیاں کھولی گئی تھیں۔ ملک کے اندر صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے بتیس فیکٹریاں جاری کی گئی تھیں اور اشیا کی درآمد و برآمد کا فیصلہ اسی محکمہ سے متعلق تھا۔ ان اصلاحات ہی کی بدولت جن کو سلطان نے جاری کیا تھا اس کا ملک ہر طرح سے مرفہ الحال اور فارغ البال تھا۔

ان دعووں کی تائید میں ہم چند دوسرے یورپین مورخین کے بیانات سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔ کیپٹن لٹل لکھتا ہے کہ: "ٹیپو کے متعلق

بہت سی افواہیں سُنی جاتی تھیں کہ وہ جابر اور ظالم حکمراں ہے جس کی وجہ سے اس کی تمام رعایا اس سے بیزار ہے۔ لیکن جب ہم اس کے ملک میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ صنعت و حرفت کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے نئے نئے شہر آباد ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ رعایا اپنے کاموں میں مصروف و منہمک ہے۔ زمین کا کوئی حصہ بھی بنجر نظر نہیں آتا۔ قابل کاشت جس قدر بھی زمین مل سکتی ہے اُس پہ کھیتیاں لہرا رہی ہیں۔ ایک انچ زمین بھی بیکار نہیں۔ رعایا اور فوج کے دل میں بادشاہ کا احترام اور محبت اتم درجہ موجود ہے۔ فوج کی تنظیم اور اس کے ہتھیاروں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ یورپ کے کسی مہذب ملک کی فوج سے کسی حالت میں بھی پیچھے نہیں ہے۔"

مورخ "سنڈلر" سے روایت ہے کہ:۔ "جس وقت فوجیں ٹیپو کے ملک میں داخل ہوئیں تو دیکھا گیا کہ تمام رعیت ہندو اور مسلمان نہایت خوش حال ہے تمام ملک سرسبز ہے۔ زراعت اچھی ہو رہی ہے۔ کل رعیّت سلطان کے نام پر فدا ہے۔"

ایک تیسرا مسیحی مسٹر "ڈبلو ٹارنس" ممبر پارلیمنٹ یوں رقم طراز ہے کہ:۔ "ٹیپو کے زیر حکمرانی میسور تمام ہندوستان میں سب سے زیادہ سرسبز اور اس کے باشندے سب سے زیادہ خوش حال تھے۔ اس کے خلاف انگریزی اور ان کے باج گزار مقبوضات کرناٹک اور اودھ وغیرہ بلکہ بنگال بھی صفحۂ دنیا پر ایک بدنما دھبّہ تھا۔

اور رعایا قانونی شکنجہ میں کسی ہوئی بالکل پریشان حال تھی۔“

آخرالذکر تحریر سے ہندوستان کے اور حصص بالخصوص انگریزی مقبوضات کی حالت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

میجر ڈائرم جو میسور کی تیسری جنگ میں شریک تھا اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر لکھتا ہے کہ :”ٹیپو نے جس اصول پر سلطنت کا نظام قائم کیا ہے اس کی وجہ سے اس کا ملک ہر جگہ آباد پایا گیا اور زمین جو قابل کاشت ہے اپنی انتہا تک قابل کاشت کی گئی ہے۔ اس کا فوجی نظام اور میدان جنگ میں اس کے سپاہیوں کی وفاداری اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس نے ملک میں ایک ایسی حکومت قائم کر رکھی ہے اور رعایا کو ایسی شخصی آزادی دے رکھی ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ بادشاہ رعایا کو تکلیف دینے والا نہیں بلکہ اُن کے دکھ درد کا شریک ہے۔ اس کا بے رحمانہ سلوک اگر کسی پر ہوتا ہے تو وہ وہی لوگ ہیں جو اس کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔“

میجر ڈائرم کے اوپر دیے ہوئے بیان سے سلطان کے نظام سلطنت۔ ملک کی سرسبزی۔ شہروں کی آبادی۔ فوج کی تربیت۔ فوجیوں کی وفاداری وغیرہ سب باتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے بیانات کی موجودگی میں بھی سلطان کے خلاف الزامات عائد کرنا سراسر بے ایمانی نہیں ہے تو اس کو

اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

رعیت کے آرام و آسائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان نے اپنی حکومت کے عاملان اور ملازمان کو بھی اس بات پر مجبور کیا کہ وہ رعیت کو نہ ستائیں۔ چنانچہ اُن کو تنخواہیں ماہ بہ ماہ دی جاتی تھیں اور رشوت لینے والوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جاتی تھی۔ سلطنت بھر میں خفیہ ہرکاروں کا تقرر کیا گیا تھا کہ ملازمان کی زیادتی اور بے قاعدگیوں کی اطلاعات خفیہ طور پر اس کے پاس پہونچتی رہیں۔

ملازمان کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے ان کی سول لسٹ شائع کرائی جاتی تھی تاکہ ان کو اپنی ترقی و تنزلی وغیرہ کی بابت صحیح حالت کا اندازہ ہوتا رہے۔ ان کی ترقیاں بھی باقاعدہ ہر تیسرے سال ہوا کرتی تھیں۔ ان اصلاحات کی وجہ سے حکومت کے ملازم مطمئن اور خوش تھے۔

سلطان کی پولیس عام طور پر اعلیٰ درجہ کی تھی۔ سرقہ کے انسداد پر سلطان نے خاص توجہ دی تھی۔ اگر افسران متعلقہ کی غفلت کی وجہ سے چوری کرنے والوں کا پتہ نہیں چلتا تھا تو بہ قول ایک مورخ "اس نقصان کی تلافی عاملان حکومت کو کرنا ہوتی تھی"۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اول تو چوری ہوتی ہی نہیں تھی اور اگر کوئی واردات ہوئی بھی تو چور گرفتار ہو جاتے تھے۔ اور مال مسروقہ

مل جاتا تھا۔ ولکس، کا کہنا ہے کہ چوروں اور مجرموں کو سخت اور عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ دوسروں کو ارتکاب جرم کی جرأت نہ ہو۔ رعایا کو حفاظت اور دیگر ضروریات پورا کرنے کے لیے اسلحہ رکھنے کی عام اجازت تھی۔

عدالت اور انصاف ایسا عام تھا کہ اس کے حصول کے واسطے فریادیوں کو نہ تو موجودہ زمانہ کی طرح دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی اور نہ بے جا اخراجات سے زیر بار ہی ہونا پڑتا تھا۔ ہر گاؤں اور آبادی میں پنچایتیں قائم کر دی گئی تھیں اور مقدمات کا فیصلہ پنچوں کی رائے سے ہوتا تھا۔ ان پنچایتوں میں جھوٹ۔ فریب۔ اور دھوکہ بازی کی قلعی کھل جاتی تھی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا تھا۔ پنچایت کے فیصلے فریقین کو ماننا پڑتے تھے البتہ اس کے فیصلہ سے اگر کوئی فریق مطمئن نہ ہو تو اس کو اختیار تھا کہ معاملہ صدر عدالت میں لے جائے جہاں ایک ہندو اور ایک مسلمان حاکم ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے خصوصی مقدمات کا فیصلہ قاضیوں کے ذریعہ کرایا جاتا تھا اور ہندوؤں کے مقدمات شاستروں کی رو سے پنڈت لوگ فیصل کرتے تھے۔ اس طرح سے رعایا مطمئن بھی رہتی تھی اور اس کو مقدمات کی پیروی میں بے جا اخراجات سے زیر بار بھی نہیں ہونا پڑتا تھا۔ مقدمات کے فیصلوں میں جلدی کی جاتی تھی اور آج کل کی طرح مقدمات [illegible]

سالہا سال تک لٹکتے نہیں رہتے تھے۔ جن لوگوں کو عدالتی کارروائیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ موجودہ دور کی دقتوں اور قباحتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

پوری مملکت میں نظام کی یکسانیت برقرار رکھنے کے لیے و نیز ضروری امور پر تبادلۂ خیالات کی غرض سے سلطان نے عاملۂ حکومت کی ایک مجلس مشاورت بھی قائم کی تھی۔ ڈولکس، اس کے بارہ میں لکھتا ہے کہ:۔ "ٹیپو سلطان نے اپنے افسران ضلع کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر سال وہ پایہ تخت میں جمع ہو کر انتظامی معاملات میں مشورہ کریں۔"

جن لوگوں کو انتظامی معاملات کا تجربہ ہے وہ اس طریقہ کی ضرورت اور خوبیوں سے بخوبی واقف ہیں۔

امورِ سلطنت میں اصلاحات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ سلطان اپنی رعیت کی اخلاقی حالت درست کرنے سے بھی غافل نہیں تھا۔ چنانچہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں کی حکومتوں نے مملکت میسور میں منشیات کے استعمال کو رفتہ رفتہ کم کیا۔ پہلے تو منشیات کی فروخت پر بھاری بھاری ٹیکس عائد کیے اور پھر رفتہ رفتہ ان کا استعمال ہی حدودِ ریاست میں ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے ان احکامات سے گو حکومت کے مالیہ کو نقصان پہنچا مگر اس نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی اور رعایا کے اخلاق کی اصلاح کو مقدم رکھا۔ "بورنگ" کہتا ہے کہ "ٹیپو نے منشیات کو ممنوع

قرار دے کر ایک عاقل ریفارمر کا کام کیا تھا اُسی کے متعلق رئیس" لکھتا ہے کہ منشیات کو ممنوع قرار دینے سے سلطنت کی آمدنی میں جو کمی ہوئی اُس کو سلطان نے دوسرے طریقوں سے پورا کیا۔

آج بھی ہندوستان میں اسی کی جدوجہد ہو رہی ہے اور ہماری قومی حکومتیں منشیات کے استعمال کو روکنے کے واسطے وہی طریقے اختیار کر رہی ہیں کہ جو سلطان نے رائج کیے تھے۔ اور جن میں وہ کامیاب ہوا تھا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ٹیپوؒ نے جس مرض کا علاج اپنی تھوڑی ہی سے دنوں کی حکومت میں کر لیا تھا۔ ہمارے ملکی ریفارمر ملک کو اس بلا سے کتنے عرصہ میں نجات دلا سکیں گے۔

غرضیکہ ملک کی ترقی کی ہر چھوٹی اور بڑی اصلاح کی طرف سلطان نے دھیان دیا۔ اس نے اپنے ملک میں بنک بھی کھولے اور ٹکسال بھی جاری کی جس میں چاندی اور سونے کے مختلف قیمتوں کے چھوٹے اور بڑے سکّے ڈھالے جاتے تھے۔

سلطان کا محکمہ تعمیرات بھی تھا۔ سرکاری عمارتوں، پلوں وغیرہ کی تعمیر وغیرہ کا سب انتظام اور بندوبست اسی محکمہ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

سلطانی فوج کے باقاعدہ اور منظم ہونے کے متعلق ہم پہلے جا بجا حوالہ جات دے آئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فوج کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی اور فوجی محکمہ کا ہر شعبہ

نہایت عمدہ حالت میں تھا۔ اور بہ قول مصنف ماڈرن میسور: "ملک کی مدافعت کے لیے ایک لاکھ اسّی ہزار کی بہترین منظم اور باقاعدہ فوج تھی اس کے علاوہ ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو کی فوج امدادی تھی جو مختلف فوجی کاموں پر مامور تھی۔"

آج ہم سنتے ہیں کہ ہندوستانی نہ تو اچھے اسلحہ بنا سکتے ہیں اور نہ ان کو جہاز سازی کا سلیقہ ہے۔ مگر سب مورخین متفق ہیں کہ سلطانی فوج بہترین اسلحہ جات سے مسلح تھی۔ ان میں سے بہت سے تو یورپین ساخت کے تھے مگر زیادہ تر وہ تھے جو میسور ہی کے اندر تیار کیے جاتے تھے اور جن کی تیاری کے واسطے سلطان نے ملک میں بہت سے اسلحہ خانے کھول دیے تھے جن کے تیار کیے ہوئے اسلحہ جات کسی صورت میں بھی یورپین اسلحہ جات سے کم تر نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح سلطان اپنی فوجی ضرورتوں کے لیے کسی دوسرے ملک کا محتاج نہیں تھا۔ اس نے فوجی افسران کی تعلیم و تربیت کے واسطے جن کی ہر آزاد ملک کو ضرورت ہوتی ہے، ایک حربیہ مدرسہ بھی جاری کیا تھا۔ سچ ہے اگر ارادہ میں پختگی ہو تو ہر کام انجام پا سکتا ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہندوستانی رئیسوں میں صرف رئیس میسور ہی نے ملک کی حفاظت کے لیے بحری بیڑہ کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور حیدر علی نے اپنی زندگی ہی میں اس کی طرف

توجہ دینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ حیدر علی کی وفات کے وقت چند جہاز موجود بھی تھے مگر ٹیپو سلطان نے بادشاہ ہوتے ہی بحری طاقت کو بڑھانے اور بحری فوج کو تربیت دینے کے واسطے ضروری قدم اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔

'رئیس' اپنی تاریخ میں اس کے متعلق یوں رقم طراز ہے :-

"بحری بیڑہ پہلے بورڈ آف ٹریڈ کے ماتحت رکھا گیا۔ اس سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ بحری قزاقوں سے ساحل کی حفاظت کرے۔ ان میں بار برداری کے جہاز بھی تھے۔ اور یہ جہاز تجارتی سامان لے کر ایران و عرب کی بندرگاہوں تک جاتے تھے۔ ۱۷۹۲ء میں جب سلطان کو شکست ہوئی اور سلطنت کا کچھ حصہ ہاتھ سے نکل گیا تو سلطان کو معلوم ہوا کہ بحری بیڑے کی شکست کی وجہ سے اس کو شکست ہوئی سلطان نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تنظیم شروع کی تاکہ انگلستان کی بحری فوج کا مقابلہ کیا جائے۔ جنگ کے بعد ۱۷۹۳ء میں سلطان نے بھٹکل میں بحری مدرسہ قائم کیا۔ طرز تعلیم انگریزی طرز جہازرانی پر رکھی گئی۔ بحری فوجی تعلیم کے لیے ایک کتاب لکھی گئی۔ جس میں جہاز کی ایک کیل سے لے کر پورے جہاز کی ضروریات جہازوں کی تعمیر۔ جنگ کے قواعد جہاز چلانا۔ سپاہیوں کی خوراک۔ ہار بربنانا وغیرہ کے متعلق مفصل اور مشرح احکام موجود تھے۔ پھر جہازی بیڑے کو بورڈ آف ٹریڈ سے

نکال کر ایک خاص بحری کمیشن کے سپرد کیا گیا۔ اس میں گیارہ میریم (لارڈ آف میرلٹی) اور تیس میر بحر (اڈمیرل) تھے۔ جن میں دس ساحل پر اور بیس جہازوں پر رہتے تھے۔

اسی سال سلطان نے سو جنگی جہاز تیار کرنے کا حکم دیا۔ ۱۷۹۴ء میں سلطان نے بیس جہازوں کو ناقابل ٹھہرا کر ڈبو دینے کا حکم دیا۔ سلطان کی بحری فوج میں دس ہزار پانچ سو بیس ملاح تھے۔"

"جنگی جہازوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ۷۲ توپ کا ایک بڑا جہاز جس کے ماتحت ۷۲ چھوٹے جنگی جہاز تھے۔ ۶۲ توپ کا ایک بڑا جہاز جس کے ماتحت ۶۶ چھوٹے جنگی جہاز تھے۔"

اسی شعبہ کے متعلق دوسرے مورخ "بورنگ" کا بیان بھی درج کیا جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔ "اس کی وہ آنکھیں جو ہمیشہ بیدار رہتی تھیں اُن سے ایک زبردست بحری بیڑے کی ضرورت بھی چھپی نہیں رہی۔ اس کے متعلق اُس نے ایک فرمان جاری کیا جس میں جہازات بنانے کے طریقے۔ لکڑی کا انتخاب اور تمام بحری قواعد و ضوابط درج تھے۔ اُس نے اس فرمان میں جزئیات تک پر بحث کی تھی۔ یہاں تک کہ جہازوں کے پیندوں کے لیے کس قسم کی دھات اور کیلیں لگائی جائیں اس میں لکھا تھا۔ اس فرمان کی رو سے اس نے ایک محکمہ بحری (بورڈ آف اڈمیرلٹی)

قائم کیا تھا۔ جس میں گیارہ میریم اور بتیس میر بحر تھے۔ اس فرمان میں حکم کیا گیا تھا کہ مندرجہ ذیل جہازات بنائے جائیں۔ بیس اول و دوم قسم کے بڑے جنگی جہاز۔ جن میں ہر ایک پر علی الترتیب ۷۲ اور ۶۰ توپیں چڑھ سکتی تھیں۔ ۲۰ تیسری قسم کے بڑے جنگی جہاز جن میں ہر ایک پر ۴۶ توپیں چڑھ سکتی تھیں۔ سلطان نے یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ جب کبھی میریم معائنہ کے لیے آئے تو سرکاری خرچ پر جہازوں کے ملازم اس کی دعوت کا انتظام کریں۔

مندرجہ بالا تجویز کے مطابق جہازوں کا بنانا شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی یہ تجویز تکمیل کو نہیں پہونچی تھی کہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

کاش اگر سلطان کی زندگی وفا کرتی اور یاران وطن اس کو مہلت دیتے تو آج ہندوستان دنیا کے بہترین بیڑے کا مالک ہوتا اور ہندوستان کی حالت وہی ہوتی جو اچھے اور عمدہ بیڑے رکھنے والے ممالک کی ہے۔ مگر ہندوستان کی قسمت میں تو غلامی کا طوق پہننا ہی لکھا جا چکا تھا چنانچہ وہی ہو کر رہا اور آج ہندوستانی بیڑا باوجود ہندوستانیوں کی پیہم جدوجہد اور چیخ پکار کے صرف چند جہازوں پر مشتمل ہے اور وہ بھی بہت معمولی درجہ کے جہاز ہیں۔ بحری تعلیم اور جہاز سازی کی تو ابھی ملک میں ابتدا ہوئی ہے۔

سلطانی اصلاحات میں سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر

اصلاحِ مجلس وطنی کا قیام تھا۔ سلطان ایک سچے مسلمان کی طرح شخصی آزادی اور مساوات کا علمبردار تھا۔ اس نے اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے بھی جد و جہد کی اور سلطنت کے انتظام میں رعایا کو شریک کرنے کی غرض سے ایک پارلیمنٹ قائم کی جس میں رعایا کے نمائندوں کو ممبر بنایا گیا۔ اور اپنی حیثیت صرف ایک آئینی حکمراں کی رکھی لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میر صادق علی کی غداری کی وجہ سے یہ مجلس ناکارہ ہو کر رہ گئی کیونکہ اس میں ایسے نا اہل لوگ منتخب ہو کر آئے جو میر صادق کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے تھے چنانچہ ان حالات کی وجہ سے اس مجلس سے ملک کو وہ فائدہ نہیں پہونچ سکا جو سلطان کے پیشِ نظر تھا۔ لیکن سلطان کی اس کوشش سے تو یہ بات صاف ظاہر اور عیاں ہے کہ اس کے دل میں جمہوریت کی کس قدر تڑپ تھی اور بہ قول "ولکس"، "جمہوریت جس کی اس وقت فرانس میں دھوم تھی وہ ٹیپو کے یہاں کوئی نئی یا تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اس نے ہر شخص کو مساوات دے رکھی تھی"

مگر افسوس ہے کہ ان اصلاحات کے جاری کرنے کے باوجود بھی سلطان تیرِ ملامت کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ میسور گزیٹیر کے مصنف نے کس قدر سچ لکھا ہے کہ :-

"ابھی تک ملک میں اس کی اصلاحات پر وہ نظر نہیں ڈالی گئی ہے جس کی وہ مستحق ہے یقیناً اس کی اصلاحات حد درجہ قابل تعریف و توصیف ہیں۔ یہ ایک بدقسمتی ہے کہ ٹیپو کی زندگی کا صرف تاریک پہلو مدنظر رکھا جاتا ہے، اور اس کے روشن پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ٹیپو کی اصلی شخصیت ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی۔"

سلطان کی مذہبی رواداری

ہم نے پچھلے ابواب میں سلطان ٹیپو کے ذاتی کیرکٹر۔ اُس کے شاہانہ کارناموں اور میدان جنگ میں اُس کی جدوجہد اور بہادری کا مختصراً ذکر کر دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شخصی اعتبار سے وہ کتنا بلند پایہ انسان تھا۔ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اور ہم عصروں کے مقابلہ میں بڑی حد تک ایک آئینی حکم راں کہلانے کا مستحق ہے اس نے اپنے زمانہ حکومت میں ان سب اداروں کے قیام اور ترقی پر توجہ دی جن پر ملک اور پبلک دونوں کی بہبودی اور ترقی کا انحصار ہے۔ اپنے ملک کو غیر ملکیوں کی گرفت سے بچانے کے واسطے اُس نے ہر وہ کوشش کی کہ جو اُس کے زمانہ میں کوئی اور نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ملک کو غلامی سے آزاد رکھنے کے واسطے ہی اُس نے اپنی زندگی وقف کر دی اور اسی کوشش میں اُس نے خوشی خوشی جام شہادت نوش کیا اگر اور حکم رانوں کی طرح وہ بھی خود غرض ہوتا اور اس کو اپنے ذاتی اغراض ہی کا خیال ہوتا تو وہ نہایت آسانی سے اپنی جان۔ اپنا خاندان اور اپنے املاک کو محفوظ رکھ سکتا تھا جیسا کہ اس کی اور ہم عصر ریاستیں اُس کی آنکھوں کے سامنے کر رہی تھیں مگر نہیں اُس کا تو مطمح نظر ہی مختلف تھا۔ اور اسی کے حصول کی کوشش میں اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

یہ سب باتیں بتا دینے کے بعد اب ہم سلطان کی ایک اور خوبی
کا کچھ حال بیان کر کے اس مختصر کتاب کو ختم کرتے ہیں وہ خوبی جس کی
طرف ہم نے اشارہ کیا ہے سلطان کی مذہبی رواداری ہے۔
سلطان مسلمان پیدا ہوا مسلمان زندہ رہا اور مسلمان ہی اس دنیا
سے گیا وہ اپنے مذہبی اصولوں کا نہایت سختی سے پابند تھا اور
مذہب میں اضافی باتوں کو کرنا نہ تو خود پسند کرتا تھا، اور نہ
دوسروں کو اس کی اجازت دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی حکومت کے
ناعاقبت اندیش اور خود غرض ملا نے صرف اسی وجہ سے اس کے
خلاف ہو کر انگریزی پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے تھے جو بالآخر
سلطان کی ناکامیابی کا باعث بن گیا مگر یہ بات روز روشن کی
طرح ظاہر ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے اس نے اپنے مملکت
میں ہر مذہب کے ساتھ پوری پوری رواداری برتی تھی۔ اس کے
ملک میں ہر مذہب کے پیرو کو پوری آزادی تھی کہ جس طرح چاہے
اپنے خالق کی پوجا کرے اور جو مذہب چاہے اختیار کرے سلطان
نے صرف یہ ہی نہیں کیا بلکہ حکومت کی طرف سے غیر مذہب والوں
کے مذہبی اداروں کو ضروری امدادیں بھی دیں چنانچہ سلطنت
میسور کا ذرہ ذرہ آج اس کی رواداری اور روشن خیالی کی
داستان سنا رہا ہے۔ میسور کی مملکت کے پرانے پرانے مندر۔ ان کا
محل وقوع ان کے متعلقہ جاگیریں سب اسی کی رواداری پر گواہ ہیں

دنیا والوں نے اگر اب تک سلطان کی اس خوبی کو تسلیم نہیں کیا ہے تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب سلطان کے جذبہ رواداری کو ملکی اور غیر ملکی یک زبان ہو کر سراہیں گے اور سلطان کے صحیح مرتبہ کو پہچانیں گے۔

میسور کے آرکولاجیکل ڈیپارٹمنٹ کے کاغذات دیکھنے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ سلطان ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا کس قدر احترام کرتا تھا۔ اور ان کی ضروریات پورا کرنے اور ان کی تکالیف کے رفع کرنے کا اُس کو کس قدر خیال تھا۔ ذیل کے اقتباسات ان امور پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

مرہٹوں نے جب سرنگری کے مندر کو لوٹا اور سارداد یوی کی مورتی کو اس کے مقام سے ہٹا کر پھینک دیا تو گروتے اس امر کی اطلاع سلطان کو دی اُس نے گروجی کو جو جواب دیا وہ یہ ہے کہ "ہم ان دشمنوں کو سزا دے رہے ہیں جو ہمارے ملک پر چڑھائی کر کے ہماری رعایا کو ستا رہے ہیں آپ کی ذات تقدس مآب اور تارک الدنیا ہے اس لیے یہ آپ کا اور مندر کے دوسرے برہمنوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے دشمنوں کی تباہی کے لئے خدا سے دعا کریں کہ ہمارا ملک محفوظ اور ہماری رعایا خوش وخرم رہے۔"

پھر گروجی کے اطلاع دینے پر کہ مرہٹوں نے مندروں میں گھس کر برہمنوں کو زخمی اور قتل کر دیا ہے اور مندروں کا سامان

لوٹ کرے گئے ہیں اور سارداؤ دیوی کا بت بلا حکومت کی تائید اور امداد کے نصب کرنا ناممکن ہے۔ سلطان نے جواباً لکھا:۔ "ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہیں آتے یقین ہے اس کل جگ میں انھیں بہت جلد اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ملے گا۔ لوگ بدی کا کام ہنستے ہوئے کرتے ہیں لیکن خمیازہ روتے ہوئے بھگتیں گے۔ گروؤں سے دغابازی خود اپنی نسل کو منقطع کرنا ہے۔"

پھر آگے چل کر لکھا ہے:۔ "آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی ضرورت ہو حاصل کرلیں اس رقم اور اجناس سے سارداد یوی کے بت کو نصب کرتے ہوئے برہمنوں کو کھانا کھلائیں اور ہمارے دشمنوں کی تباہی کے لیے دعا کریں۔"

مندروں کے پجاری اور گرو سلطان کو تحفہ جات بھیجتے تھے اور سلطان اُن کو چنانچہ ایک خط میں سلطان گروجی کو تحفہ بھیجتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"آپ کا بھیجا ہوا پرشاد اور شالیں موصول ہوئیں۔ آپ کے استعمال کے واسطے ایک جوڑی شال اور دیوی کے بت کے لیے کپڑے روانہ کیے جاتے ہیں۔"

ایک مرتبہ جب گروجی نے پوجا کی اُن رسموں کے واسطے سلطان سے مالی امداد چاہی جن کا سلسلہ متواتر اڑتالیس دن تک جاری

رہتا تھا تو سلطان نے فوراً اپنے عامل کو حکم دیا کہ خود گرو جی کے پاس جائے اور پوجا کے متعلق جملہ انتظامات کی تکمیل میں مدد دے اور گرو جی کو تحریر کیا کہ :- "آپ کی حسب مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی دینے کے متعلق نگر کے آصف کو حکم بھیج دیا ہے"

ایک اور خط میں گرو جی کو اطلاع دی کہ سارداد یوی کے بت کے استقبال کے واسطے ایک پالکی اور گرو جی کے استقبال کے واسطے ایک دوسری پالکی بھیجی جاتی ہے۔ ایک دوسرے عامل کو حکم دیتے ہوئے لکھا کہ :- "سوامی جی سمندری غسل کے لیے جانے والے ہیں انھیں سفر میں تمام ضروریات مہیا کیے جائیں"

جب سوامی جی مرہٹوں کے سردار سے اپنے مندروں کی لوٹ کا سامان واپس لینے کے واسطے خود سلطنت کے باہر تشریف لے گئے تو سلطان نے اُن کو پروانہ راہداری دیا اور دوران سفر میں اُن کے آرام و آسائش کے واسطے مکمل انتظامات کیے اور اپنے عاملان کو تاکیدی خطوط لکھے کہ سوامی جی کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے سوامی جی کو مرہٹوں کے ملک میں دیر ہو جانے پر تحریر فرمایا کہ :-

"آپ جگت گرو ہیں آپ دنیا کی بھلائی کے لیے ہمیشہ عبادت میں رہتے ہیں جس ملک میں آپ جیسی مقدس ہستی موجود ہو اُس ملک میں خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ بارش اور فصلیں اچھی ہوتی ہیں۔ آپ کو ایک

غیر ملک میں اس قدر عرصہ ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا کام جلد انجام پہونچا کر اپنے ملک میں واپس آجائیے ۔"

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں اور تحریریں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان اور گرو جی اور سوامی جی کے تعلقات بہت شگفتہ تھے اور سلطان ہر وقت ان کے اعزاز کے مطابق ان کی عزت اور امداد کرنے کے واسطے تیار رہتا تھا۔

ریاست کے کاغذات کے دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی طرف سے ریاست کے سب مندروں کو نقد جنس اور تحفہ جات کی امداد دی جاتی تھی۔ مندروں کے بتوں کے واسطے زیورات اور پوشاکیں بھی ریاست سے ملتی تھیں۔ بہت سے مندر جو اب تک موجود ہیں خود حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں۔ اور ان کی مذہبی رواداری کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔

چنانچہ ان واقعات کی موجودگی میں بھی سلطان کو متعصب کہنا اور اس پر اس نوعیت کا الزام لگانا سراسر ہٹ دھرمی کی بات ہے۔

مہاتما گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا میں سلطان ٹیپو کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا اس کا ترجمہ ناظرین کے مطالعہ کے واسطے درج کیا جاتا ہے:-

---

"ٹیپو سُلطان اور گروایور کا مندر"

"اسلامی بے تعصّبی"

"ٹیپو سلطان میسور کا مشہور بادشاہ گزرا ہے اُس نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں انگریزوں سے سخت جنگ کی تھی۔ اگر اُس وقت نظام حیدرآباد دکن انگریزوں سے نہ مل جاتے تو سلطان ٹیپو انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیتا۔ یہ بادشاہ بہت ہی بہادر تھا اُس نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے فرانس کے مشہور بہادر نپولین بونا پارٹ سے بھی بات چیت کی تھی۔ یہ بادشاہ جس قدر بہادر تھا اُسی قدر خدا ترس اور بے تعصب تھا اُس کی نگاہیں ہندو اور مسلمان دونوں پر برابر تھیں کسی سے وہ تعرّض نہیں کرتا تھا۔ آؤ ہم تمھیں ٹیپو سلطان کے متعلق ایک واقعہ سُنائیں کہ اُس نے مالابار کے ایک مشہور مندر کو بربادی سے کس طرح بچا لیا۔

"مالابار میں گروایور کا مندر بہت پُرانا اور مشہور ہے۔ مالابار کے ہندوؤں کا اگر اس کو کعبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ہزاروں خوش اعتقاد اُس کی زیارت کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے مشہور دیوتا اوتار کرشن جی مہاراج کے والد واسدیو نے وشنو کی یہ مورت اپنی پرستش کے لیے ایک

خواب دیکھ کر بنائی تھی اور گرو برہسپتی اور وایو نے جنوبی ہند میں ایک مناسب مقام تلاش کرکے یہ مورت نصب کی اور اسی لیے اس کا نام گروایور قرار پایا۔ سلطان ٹیپو جب مالابار فتح کرتا ہوا گروایور کے قریب پہونچا تو اس مندر کے پجاری بہت گھبرائے اور انھوں نے دیوتا کی بیش قیمت مورت کو ریاست ٹراونکور کے ایک مشہور مندر میں بھیج دیا۔

ٹیپو سلطان تو گروایور کے قریب ہی ایک مقام پر رک گیا اور اپنی فوجوں کو گروایور فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے سپاہیوں نے گروایور کو فتح کرلیا اور چونکہ ان دنوں مسلمانوں کی مرہٹوں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اس لیے بعض مسلمان سپاہیوں نے ازراہ انتقام اس مندر کو جلا کر خاک کر دینا چاہا۔ چنانچہ چند سپاہیوں نے مندر کی دیواروں پر گھی چھڑک کر آگ لگا دی عمارت تھوڑی ہی جلنے پائی تھی کہ ٹیپو سلطان کے افسروں کو اپنے بادشاہ کے احکام کا خیال آگیا اور انھوں نے جلدی جلدی آگ بجھا کر مندر کے دو تین برہمنوں کو ٹیپو سلطان کے پاس بھیجا کہ وہ جا کر شورش پسند سپاہیوں کی شکایت کریں۔

ٹیپو سلطان نے جس وقت پجاریوں سے یہ سنا کہ اس کے چند شریر سپاہیوں نے مندر میں آگ لگانے کی کوشش کی تو وہ بہت ناراض ہوا اور رات ہی رات سفر طے کرکے گروایور پہونچا۔ یہاں

پہونچ کر اُس نے تحقیقات شروع کی اور جن مسلمان سپاہیوں نے
مندر میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی اُن کو سخت سزا دی مندر
کو درست کرایا۔ اور حکم دیا کہ اس شہر سے جو کچھ آمدنی ہو وہ سرکاری
خزانہ میں داخل کرنے کے بجائے ہمیشہ اس مندر کو بخش دی جا رہے
جب اُس کو معلوم ہوا کہ پجاریوں نے اس کے خوف سے مندر کی
مورتی کو ٹراونکور بھجوادیا ہے تو اُس نے حکم دیا کہ دیوتا کی مورت
کو فوراً واپس منگا کر اس مندر میں نصب کیا جائے۔

برخلاف اس کے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ مسلمان پیروں
کی غلط شکایت پر جو انھوں نے اسلامی سلطنت اور اسلام کا واسطہ
دے کر کیں اُس نے کوئی توجہ نہیں دی چنانچہ لارڈ ولنٹیا ایک واقعہ
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"پیر لدا نامی ایک بزرگ سرنگا پٹم میں رہتے تھے جنھوں نے
ایک بار شکایت کی کہ ہندوؤں نے اُن کے معتقدوں کو بہت
مارا پیٹا ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ زیادتی مسلمانوں کی ہے۔ ہوا
یہ کہ ہندوؤں کا جلوس جا رہا تھا جس پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔
پیر لدا نے کہا کہ ہندوؤں کا اس طرح مسلمانوں کو مارنا گویا
اسلام کی توہین کرنا ہے۔ اور یہ سلطنت بہ حیثیت ایک اسلامی سلطنت
ہونے کے اس کا فرض ہے کہ اسلام کو ایسی توہین سے بچائے۔ اور
اس واقعہ میں قرار واقعی قدم اُٹھایا جائے۔ تاکہ آئندہ اور اسی طرح

آزادانہ دست برد کا سلطان ہی باعث نہ ہو جائے۔ جواب ملتا ہے
کہ سلطنت کی نظر میں ہندو اور مسلمان دونوں مساوی ہیں۔ پیرلدا
نے کہا اگر یہی حال رہا تو میں حدود سلطنت سے باہر چلا جاؤں گا
جس پر سلطان کی طرف سے جواب ملا کہ جو مرضی میں آئے کیا جائے
پیرلدا مدراس میں جا کر مقیم ہوئے اور وہیں رہ گئے"
سلطان کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری کے متعلق گاندھی جی
نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں جو تحریر فرمایا ہے اس کی نقل
نیچے دی جاتی ہے اس کے بعد ہم سلطان کی رواداری کی بے شمار
مثالوں کو ڈھونڈھنے اور یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

"ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ"

"میسور کا بادشاہ فتح علی ٹیپو سلطان اجنبی (انگریزی) مورخوں
کی نگاہ میں تو وہ متعصب مسلمان تھا جس نے اپنی ہندو رعایا کو
بہ جبر مسلمان کیا۔ لیکن یہ سب جھوٹ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ
ہندوؤں سے اس کے تعلقات بہت دوستانہ رہے۔ اس کے
کارنامۂ زندگی کی یاد ایسے وقت میں جب کہ ہندو اور مسلمان اپنے
اصلی بدیسی دشمن کو بھول کر جو دروازے پہ ڈیرہ جمائے ہوئے ہے
ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہیں اور خود و خوض کی قوت ان
سب سے سلب ہو چکی ہے دل میں مسرت کی ایک گدگدی پیدا

کر دیتی ہے۔ اس عظیم المرتبت سلطنت کا وزیر اعظم ایک ہندو تھا۔ جس نے نہایت شرم سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس فدائے آزادی کو دغا دے کر دشمنوں کے ہاتھ میں دے دیا۔

میسور کے محکمہ آثار قدیمہ کے پاس اس وقت سلطان کے وہ تیس سے زائد خطوط ہیں جو سلطان نے سری نگری مٹ کے شنکر آچاریہ کو لکھے تھے یہ خطوط کنڑی زبان میں ہیں ٹیپو ایک خود مختار حکمراں تھا۔ مگر اسے کبھی اس کا خیال بھی نہیں ہوا کہ ہندو ساہوکاروں کو اس پر مجبور کرے کہ وہ اپنا حساب و کتاب عربی حرفوں میں لکھیں بہ خلاف اس کے اس نے خود اپنی قومی زبان میں شنکر آچاریہ کے خطوط کا جواب دیتے ہوئے تپسیا (دعا خوانی) کی درخواست کی تھی۔ اور اپنے ملک کی بھلائی اور ساری دنیا کی فلاح کی دعا چاہی تھی۔ کہ آپ میسور جلد واپس آئیں۔ کیونکہ نیکوں کے قدم کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور فصل اچھی ہوتی ہے۔ (یہ خط اس قابل ہے کہ زریں حروف میں لکھا جائے اس موقع پر ینگ انڈیا نے کنڑی زبان کے اس خط کو دیوناگری حروف میں دیا ہے) ٹیپو نے ہندو مندروں کے لیے نہایت فیاضی سے جائدادیں وقف کیں اور خود سلطان ٹیپو کے محلات کے گرد و پیش "شری ونگٹا رامنا" "سرنیواس" اور "شری رنگ ناتھ" کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہیں

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہید ملت سلطان شہید جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں مل سکتا اپنی عبادت اشتد میں ہندوؤں کی پوجا کی گھنٹیوں سے پریشان نہ ہوتا تھا۔ ٹیپو آزادی کے ساتھ جنگ کرتا ہوا شہید ہوا مگر اُس نے دشمنوں کی اطاعت گوارا نہ کی؛

ہمیں بھی سلطان ٹیپو کے اس الہامی مقولہ کو یاد رکھنا چاہیے۔

"دو دن شیر کی طرح جینا کتّوں کی دو سو سال کی زندگی سے بہتر ہے"

"یا اللہ جنگ کی اس بدلی میں جس سے ہمارے سروں پر خون ٹپک رہا ہو مر جانا ذلت اور بے حیائی کی زندگی سے ہزار گونہ بہتر ہے"

باہتمام بی۔ بی کپور سپرنٹنڈنٹ نولکشور پریس لکھنؤ میں
چھپ کر شائع ہوئے ۱۹۴۸ء